علامہ اقبالؒ

آقای مجتبیٰ مینوی

مترجمہ

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

اقبال، لاہور

علامہ اقبال

آقای مجتبیٰ مینوی

ترجمہ

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، لاہور

علامہ اقبال

جملہ حقوق محفوظ

طبع دوم : فروری ۱۹۸۸ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
اعزازی معتمد بزم اقبال لاہور

مطبع : اظہر سنز پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۳۵ روپے

بہ شکریہ و اجازت فاضل مصنف

پیش لفظ

عہدِ وسطیٰ میں اسلامی سلطنت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ ایشیائے کوچک سے لے کر بنگال کے مشرقی حدود تک ساری کی ساری سرزمین اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ لسانی اشتراک نے معاشرتی ارتباط کی بنیادوں کو اور بھی استوار کر دیا تھا۔ ایک سیاح بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں سے نکل کر ایران و ہندوستان کے کسی گوشے میں بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔ مغلیہ دورِ حکومت میں ہزارہا ہستیاں ایران کی سرزمین سے ہندوستان میں وارد ہوئیں اور اُن کا آنا ایسا تھا جیسے کوئی انسان وطن کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے میں پہنچ جائے۔ عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری اور ملک قمی، دہلی، گجرات اور دکن میں رہ کر بھی پردیسی نہ بن سکے۔ ان کے شاعرانہ نغمے اس دیس میں اس رسیلے پن سے لہلہائے گویا ایران کی رنگین فضا میں سانس لے رہے تھے۔

ایران و ہندوستان کی یہ تہذیبی اور ثقافتی یگانگت صدیوں تک قائم رہی۔ دہلی کی مرکزی حکومت کے انحطاط سے ان دو عظیم الشان ملکوں کا باہمی رشتہ ٹوٹنے لگا اور باہمی مغایرت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک میں ایک غیر قوم کے سیاسی تسلط نے ہمارے معاشرتی نظام کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور قدیم تہذیبی روایات ڈگمگانے لگیں۔ ایران سے ہمارے لسانی اور ادبی روابط اور

بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ دونوں ہمسایوں میں بیگانگی سی پیدا ہو گئی۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایران کے سیاسی اُفق پر انقلاب کی گھٹائیں اُبھر آئیں۔ فارسی ادب نے بھی ایک کروٹ لی اور اس میں بیداری اور نئی زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے نے دوسرے ملکوں کی طرح ایران کی بھی کایا پلٹ دی اور ادب ایران میں نئے نئے رجحانات نے جنم لیا۔ ہندو و پاکستان کی سرزمین میں اردو زبان و ادب بھی انہی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ حالی اور آزاد کے بعد اکبر اور اقبال کی شاعری نئی فضا میں گونج رہی تھی۔ اس باہمی مماثلت نے ایران و ہندوستان کو پھر ایک بار ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا۔ بین الاقوامی تعلقات کے ہمہ گیر اثرات نے اس قرب کو تقویت دی۔

تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے ایران سے ثقافتی وفد اس سرزمین میں وارد ہوتے اور اُن کی آمد سے اس دیس کے رہنے والوں کی فارسی زبان و ادب سے شغف کا چرچا اہلِ ایران کی نظر میں پھر ایک بار تازہ ہوا۔ پنجاب اور بالخصوص لاہور میں علامہ اقبال مرحوم کی شاعری کی عظمت اور بھی نمایاں ہوئی۔ فی الحقیقت یہ دو متوازی ادبی تحریکوں کے جدید رجحانات کی ہم رنگی کا کرشمہ تھا۔ خود علامہ مرحوم کے افکارِ عالیہ بھی اتنے جاذب تھے کہ دیکھنے اور سننے والوں کی توجہ خود بخود اُدھر منعطف ہوئی۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد علامہ کی شاعری، ان کا فکرِ سخن اور فنی محاسن کا چرچا عام ہوا اور اہلِ ایران اور بالخصوص دانش کدۂ طہران کے معلّم اور ملک کے مقتدر اور اہلِ نظر حضرات نے اُن کے کلام کو غور اور توجہ سے دیکھنا شروع کیا، جن میں ملک الشعراء بہار مرحوم، آقائے دھخدا، ڈاکٹر سعید نفیسی، ڈاکٹر صورتگر، آقائے علی اصغر حکمت، ڈاکٹر بیانی، آقائے سرمد خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان صاحب نظر بزرگوں نے اپنے تحریری بیانات اور ارشادات سے علامہ اقبال مرحوم کے بلند افکار اور ان کے کلام کی لسانی اور فنی خوبیوں کو اجاگر کیا اور اپنے ہموطنوں کے دل سے اس تعصب، تنگ نگاہی اور غلط فہمی کو دور کرنے کی سعی و کوشش کی جو عام طور پر اہلِ زبان کے دل میں اجنبی ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ یہ ایک نہایت قابلِ ستائش اقدام تھا۔

اسی گروہ میں ایک بزرگ آقائے مجتبیٰ مینوی ہیں جو کتاب ہذا کے مصنف ہیں۔

اس کتاب کے مصنف آقای مجتبیٰ مینوی طہران یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور تاریخ پڑھاتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی علوم و ادبیات میں یکساں مزاولت رکھتے ہیں اور اپنی مادری زبان، فارسی، کی طرح انگریزی بھی بے تکلف بولتے ہیں۔ عربی اور فارسی علوم اور ادبیات سے انھیں خاص شغف ہے اور اس بارے میں ان کا تبحر علمی قدما کی یاد دلاتا ہے۔ وہ خود بھی پاکیزہ اور شستہ ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ میں نے انھیں عربی، فارسی اور انگریزی اشعار بے تکلف بولتے دیکھا ہے۔ قدیم روایات سے بہرہ اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جدید ادبی اقدار سے بھی کما حقہ آشنا ہیں اور ان کی یہ تصنیف اسی ادبی ذوق کا ایک عملی نمونہ ہے۔

"اقبال لاہوری" کسی گہری ادبی تحقیق کا نتیجہ نہیں۔ اس میں کلام اقبال پر کوئی سیر حاصل تنقید بھی نہیں کی گئی بلکہ مصنف نے علامہ مرحوم کی تعلیمات کا خلاصہ اور اس کے ساتھ ان کی لسانی مہارت، اور ادبی شعور اور اسلوب کو سرسری طور پر اپنے ہم وطنوں کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ وہ مشرق کے اس بڑے مفکر اور شاعر سے روشناس ہو سکیں۔

جیسا کہ مصنف نے کتاب میں خود بیان کیا ہے موجودہ ایران، ہندو پاکستان کی ادبی سرگرمیوں سے تقریباً ناآشنا ہے۔ وہاں مرزا غالب، خواجہ عزیز الدین، شبلی اور

گرامی اور خود علامہ اقبال سے عوام بالکل بے خبر ہیں۔ غالب اور اقبال سے عام دلچسپی کا اظہار ابھی تازہ تازہ ہے اور یہ کتاب اسی اظہار کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اس کے مصنف سے کسی مبسوط اور جامع تنقیدی بیان کی توقع بے کار تھی۔ دراصل یہ کام ہمارا تھا جو آقائے مجتبیٰ مینوی نے کیا اور یہ اردو ترجمہ ان کی خدمت کا ایک اعتراف ہے جو ہماری طرف سے کیا جا رہا ہے اور یہی اعتراف اس کتاب کے طبع ہونے کا جواز بھی ہے۔ امید ہے کہ آقائے مینوی کی یہ کوشش اس ضمن میں ہمارے لیے اور بھی بہت سی ادبی اکساہٹوں کا موجب ہوگی۔

ترجمہ کرتے وقت مجھے بعض جگہ مصنف سے اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے لیکن میں نے انھیں بالعموم نظر انداز کر دیا ہے سوائے چند ایک مقامات کے جہاں اس کا اظہار نہایت ضروری تھا۔

میں ادارہ "بزمِ اقبال" کے ارکان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس کتاب کے ترجمے کا کام سپرد کر کے اس عقیدت کے اظہار کا موقع دیا جو علامہ مرحوم کے متعلق ہمیشہ سے میرے دل میں رہی ہے۔

صوفی تبسّم

لاہور ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء

پاکستان کا فارسی گو شاعر :

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
پیامی از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگاری این فقیری
دگر دانای راز آید کہ ناید

آٹھ سو سال تک فارسی زبان کو سرزمین ہندوستان میں رواج اور فروغ حاصل ہوا اور چند صدیوں تک یہ زبان یہاں کے بادشاہوں کی درباری زبان بھی رہی۔ ہند کے مشہور و معروف شعراء نے اس میں شعر بھی کہے۔ ایران کے شعراء اور ادباء کی ایک کثیر تعداد ایران سے ہندوستان میں وارد ہوئی اور اس زبان میں متعدد کتابیں نثر میں تصنیف ہوئیں۔ یہاں کے سلاطین کے حکم سے بعض ہندی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ بھی ہوا۔ ہماری ادبی وراثتوں میں سے بہت سی کتابیں، جو پہلی بار مطبوعہ صورت میں آئیں، ہندوستان ہی کی سرزمین سے ہمیں دستیاب ہوئیں۔ لیکن بے حد افسوس کا مقام ہے کہ ہند و ایران کا یہ ادبی ارتباط برقرار نہ رہ سکا اور اس آخری ایک سو سال کے عرصے میں ان دو قوموں کے باہمی تعلقات کا رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تعلقات میں جو ضعف اور فتور پیدا ہوا اس کے بیشتر ذمہ دار اور قصوروار ہمیں لوگ تھے، کیوں کہ جہاں ہندوستان میں مرزا

اسد اللہ غالب، مُلّا طاہر غنی، فارسی میں شعر کہتے تھے اور شبلی نعمانی شعر العجم لکھ رہے تھے اور عبیدی سہروردی فارسی صرف و نحو مدوّن کرنے میں مصروف تھے، ایران میں ہندوستان کے علوم، تاریخ، جغرافیہ یا ادبیات پر ایک کتاب بھی شائع نہیں ہوتی۔ ہندوستان کے ریاضی دان یورپ میں مشہور ہیں۔ لیکن ایران میں کسی نے ان کا نام تک نہیں سنا۔ ہندوستان کے دو جلیل القدر شاعر، رابندر ناتھ ٹیگور اور علامہ محمد اقبال دنیا کے شعراء اور فلاسفہ میں شمار ہوتے ہیں، لیکن ایرانی ان سے بے خبر ہیں، سوائے اس کے کہ آج سے کوئی بارہ تیرہ برس پہلے ٹیگور نے حکومتِ ایران کی دعوت پر ایران کا سفر کیا اور وہاں چند تقریریں کیں۔ اس کی ایک کتاب کا فارسی میں ناقص سا ترجمہ بھی شائع ہوا۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا، علامہ اقبال کے بارے میں ایک مختصر سا مقالہ کسی ایک فارسی کتاب میں طبع ہوا اور وہ زیادہ تر ان کے استعمال کیے ہوئے فارسی الفاظ و تراکیب کی خُرد گیریوں پر مشتمل تھا۔ اس مقالے کے علاوہ جہاں تک مجھے علم ہے، ۴۶ صفحے کا ایک مختصر سا رسالہ فارسی زبان میں چھپا ہے اور وہ بھی ایک خطبے کی صورت میں ہے جو آقای سید محمد علی داعیٔ اسلام نے حیدر آباد دکن میں شعبۂ جامعۂ معارف میں دیا تھا، اور شاید ہی کسی نے ایران میں اس رسالے کو دیکھا ہو۔

علامہ اقبال کے ادبی آثار اور افکار و اشعار کے بارے میں ہماری بے خبری اور بے اطلاعی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آقائی دھخدا نے اپنی تصنیف "کتاب امثال و حکم"[۱] میں کہیں بھی ان کا ایک شعر یا ایک سطر درج نہیں کی، حالانکہ ایران

---

[۱] یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس فاضل مصنف نے فارسی امثال اور اقوال کے مآخذ اور اسناد پر بحث کی ہے اور اساتذہ کے کلام نظم و نثر سے اسناد بھی پیش کی ہیں۔

کے متعدد شاعروں اور قافیہ بندوں کا کلام جس میں مضمون کی تازگی نام کو نہیں، حکمت و مثل کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ ایک روز ایک دوست سے اقبال اور اس کے کلام کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک محترم بزرگ جن کا کام لوگوں کی عیب جوئی اور برائی کے سوا کچھ بھی نہیں اور دنیا کے تمام معاملات میں اپنے آپ کو باخبر اور صاحب رائے خیال کرتے ہیں، اس گفتگو میں شریک ہو گئے اور فرمانے لگے:

"ہاں، ہاں میں جانتا ہوں، وہی اقبال جس نے کتاب راحت الصدور کو شائع کیا ہے"۔

ہم نے کہا کہ وہ محمد اقبال جو شاعر اور فلسفی ہے اس محمد اقبال سے جس نے محمد راوندی کی کتاب راحت الصدور کو لیڈن میں اور صدرالدین حسینی کی تصنیف اخبار الدولۃ السلجوقیہ کو لاہور میں شائع کیا ہے، الگ ہستی ہیں۔ مؤخر الذکر پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر[۱] ہیں۔ اس گفتگو کے بعد میرے دوست نے اقبال کا یہ قطعہ پڑھا:۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسی زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم، گر نروم نیستم

---

[۱] - اس طرح کے مغالطے یہاں بھی بعض باخبر بلکہ بے خبر حضرات کو ہو جاتے تھے۔ چنانچہ "شعرالعجم" کے سلسلے میں جب حافظ محمود شیرانی نے تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور رسالہ "اردو" دکن میں وہ مضامین شائع ہوتے تو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے حامیوں میں سے بھی ایک بزرگ سے ایسی ہی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ پروفیسر اقبال کے کسی مضمون کو علامہ مرحوم سے منسوب کیا گیا تھا۔

میرے دوست نے کہا:

"دیکھو کتنا اچھا مضمون ہے! ساحل ساکن اور معطل ہے اس لیے پیچ ہے اور موج چونکہ ہمیشہ حرکت اور جوش میں رہتی ہے اس لیے اس کا وجود قائم ہے۔ اگر الفاظ کی ترکیب ذرا زیادہ پختہ اور حسین ہوتی تو شعر زیادہ بلند ہوتا۔"

ہمارے وہ محترم بزرگ جو بڑا ادعا رکھتے تھے، اس گفتگو میں جو ان سے متعلق نہ تھی، کود پڑے اور فرمانے لگے:

"نہیں، نہیں، غرامیدن کے معنی آہستہ اور نرمی سے چلنا ہے اور "تیز غرامید" میں "تیزی" اور "غرام" دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور یہ بات غلط ہے۔"

مجھے بے ساختہ ایک مشہور حکایت یاد آگئی۔ ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں کے ساتھ ایک گندگی کے ڈھیر کے پاس سے گزر رہے تھے۔ وہاں ایک کتے کی لاش بھی پڑی تھی اور اس کی عفونت اور گندی بو سے آنے جانے والوں کو سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ حواریوں نے ناک بھوں چڑھائی لیکن حضرت عیسیٰؑ فرمانے لگے:

"دیکھو اس جانور کے کتنے خوبصورت سفید دانت ہیں۔"

انسان کو چاہیے کہ تنقید میں انصاف سے کام لے۔ اگر کسی شے کی برائی بیان کرے تو اس کے محاسن کا بھی ذکر کرے۔ یہ نہ ہو کہ اپنے دوستوں اور متعلقین کے کارناموں کی تو تعریف کرے اور باقی تمام دوسرے لوگوں کے کاموں کو محض بُرا بھلا کہہ کر ٹال دے۔ نظم و نثر کے بارے میں یہ بات غلط ہو گی کہ انسان لفظوں کا اسیر ہو کر رہ جائے اور معانی سے یک لخت آنکھیں بند کرے اور دل میں یہ خیال کرلے کہ اس لفظ کو پہلی مرتبہ فلاں آدمی نے اس طرح استعمال کیا ہے لہٰذا آئندہ کسی کو اظہار

کے لیے اس لفظ کو کسی اور طرح استعمال کی اجازت نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ایران کے اکثر موجودہ نثر نگاروں اور شاعروں کی طرح لفظوں کی اہمیت کو اس طرح نظر انداز کر دیا جائے کہ پڑھنے اور سننے والوں کے لیے مفہوم مبہم اور بے معنی ہو کر رہ جائے۔

جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آقای داعی الاسلام نے انصاف اور اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ اقبال کی شاعری کا سب سے اہم پہلو اس کے معنی اور مطالب ہیں۔ اس مختصر سی کتاب میں جو اقبال کو لوگوں سے روشناس کرانے کے لیے لکھی گئی ہے، اس کے کچھ اشعار درج کیے گئے ہیں۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کراؤں کہ آٹھویں صدی ہجری کے بعد ہندوستان اور ایران کی فارسی زبان میں بالتدریج اختلاف پیدا ہوتا چلا گیا۔ دونوں ملکوں میں یہ زبان ایک خاص نہج پہ چلتی رہی اور ایک خاص طرح پر انقلاب پذیر ہوتی گئی۔ پرانے زمانے میں فارسی میں جملوں کی بندش کے لیے کچھ ایسے اسلوب مروج تھے جو آج ایران میں متروک ہو چکے ہیں لیکن ہندوستان میں بدستور رائج ہیں۔ مثلاً اقبال کا یہ مصرعہ:

سرآمد روزگاری ایں فقیری[1]

کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی کی اس عبارت سے مشابہ ہے:

"و آن لذتی حقیر چنیں غفلتی عظیم بدو راہ داد"

اور اسی سے ملتا جلتا فقرہ میں نے آقای ملک الشعرا بہار کے کسی شعر میں بھی دیکھا

---

[1] ۔ مصنف کتاب نے اس "یا" کو یائے موصولہ سمجھ کر اعتراض کیا ہے، اور لسانی اعتبار سے ایسا قیاس جائز بھی ہے۔ اس کا جواب خود انھوں نے کلیلہ دمنہ کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہے ۔ لیکن عام طور پر جب کسی کلمے کو یائے وحدت کے ساتھ "آن" یا "این" کے بعد لایا جاتا ہے تو اس کے بعد ایک جملہ۔ توصیفی کا آنا ضروری ہوتا ہے جسے لفظ "کہ" سے شروع کیا جاتا ہے مثلاً:

این فقیری کہ دست بجانب ما دراز کردہ است

جس طرح ہم عربی کے بہت سے الفاظ کو ان معنوں سے جو عربی میں متداول ہیں، مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور ترکی، فارسی اور عربی کے بہت سے الفاظ سے کوئی اور مفہوم لیتے ہیں، اسی طرح ہندوستان (اور افغان اور تاجیک) نے فارسی اور عربی کے کثیر الفاظ کے معانی کو بدل دیا ہے۔ اردو شاعری ہو یا فارسی وہ ایسے لفظ استعمال کرتے ہیں جن کی صورت تو فارسی یا عربی کی ہوتی ہے لیکن ان الفاظ کے مفہوم میں ان کے اور ہمارے درمیان فرق ہوتا ہے۔ اس طرح کا فرق کبھی کبھی ان تحریروں اور شعروں میں بھی دیکھا جاتا ہے جو سرزمین ایران کے مختلف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

حوالے سے دے دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ فارسی شاعری میں حروف زائدہ کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ انھیں حروف زائدہ محض صرف نحوی قیاس آرائیوں کے بل پر کہا جاتا ہے ورنہ شعر میں کوئی حرف زائد نہیں ہوتا بلکہ اس کی کوئی نہ کوئی اہمیت ضرور ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں یہ حروف زائدہ اور بالخصوص "یا" کا استعمال بہت زیادہ ہوا ہے، وہ زائد حرف بڑے بڑے لطیف معانی پیدا کرتے ہیں جو اس کے دقیق فکر کی ترجمانی کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ اس طرح سے عبارت کا اختصار بھی قائم رہتا ہے اور لفظوں کی معنویت میں وسعت بھی پیدا ہوتی ہے۔ فقیری کی "یا" ایسی ہی ہے۔ میں اسے یائے تصغیر و تحقیر سے تعبیر کرتا ہوں یعنی فقیر حقیر۔ (مترجم)

گوشوں میں لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ غزنوی اور سلجوقی عہد میں جو کتاب قُم میں تصنیف کی جاتی یا جو شعر اصفہان میں کہا جاتا، اُس شعر سے جو طُوس میں کہا جاتا یا اس کتاب سے جو ہرات میں لکھی جاتی، الفاظ اور ان کے معانی کے اعتبار سے مختلف ہوتی تھی۔ ہندوستان، افغانستان اور تاجیکستان میں بالخصوص گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں یہ باہمی تفاوت رفتہ رفتہ زیادہ نمایاں ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض الفاظ جو آج ایران میں عامیانہ حیثیت رکھتے ہیں اور شعر میں مستعمل نہیں، ہندوستان میں فصیح اور ادبی الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔

علاوہ بریں علامہ اقبال کو کبھی کبھی اظہار خیال کی خاطر ایسے الفاظ کی ضرورت پڑی[1] جو یا تو فارسی زبان میں سرے سے تھے ہی نہیں یا اسے نہیں مل سکے۔ اس لیے انھوں نے فارسی کے معمولی اور متداول الفاظ کو لیا اور انھیں مجازی اور وسیع تر معنی دے کر استعمال کیا۔ ان میں سے ایک لفظ "خودی" ہے جس کے معنی اور مفہوم کے بارے میں ہم آئندہ اوراق میں بحث کریں گے۔

بہرحال اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ علامہ کی زبان اردو تھی اور انھوں نے

---

[1] - ہر بڑے شاعر کو ایسی ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ الفاظ کی معنوی وسعت شعر ہی میں آکر کھلتی ہے۔ دراصل الفاظ بذات خود چند حروف کے مرکبات کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ شاعرانہ تصورات ان میں حسب ضرورت معنی پیدا کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن انھیں قبول کرتے ہیں۔ جب کوئی لفظ اپنے شعری سیاق و سباق سے الگ ہوتا اور لغت کے سائے میں پناہ لیتا ہے تو پھر حرفی ڈھانچہ بن کے رہ جاتا ہے۔ علامہ اقبال کو ایک مفکر ہونے کی حیثیت سے بہت سے الفاظ کو نئے معنی عطا کرنے پڑے تاکہ وہ ان کے مفکرانہ اور فلسفیانہ تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ انھوں نے تقریباً تمام پرانے اشارات، علامات یہاں تک کہ اصطلاحات اور تلمیحات کو بھی معنوی طور پر بدل دیا۔ (مترجم)

پنجاب میں نشوونما پائی تھی اور ایسے اساتذہ سے فارسی پڑھی تھی جن کی مادری زبان فارسی نہیں تھی۔ وہ ہندوستان اور ایران کے قدیم نثر نگاروں اور شاعروں کی تصنیفات اور اشعار کے ذریعے فارسی زبان سے روشناس ہوئے تھے۔ انھیں کبھی ایران جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور شاید انھیں اس مواد کو دیکھنے یا پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملا جو ان کے عہد میں ایران میں لکھا گیا اور شائع ہوا۔[1] لیکن چونکہ وہ ایک بڑے قادر الکلام شاعر تھے اس لیے انھیں اس بات کا حق پہنچتا تھا کہ ان الفاظ میں جو وہ اظہار خیال کے لیے استعمال کرتے ہیں تصرفات سے کام لیں۔ بجائے اس کے کہ ہم ان کے الفاظ و تعبیرات پر نکتہ چینی اور رد و قدح کریں ہمیں چاہیے کہ ہم ممنون ہوں کہ اس جلیل القدر شاعر نے کہ جس کی مادری زبان اردو تھی، فارسی زبان کو اپنے علمی اور فلسفیانہ اور شاعرانہ افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ آپ کہیں گے بہت خوب۔ لیکن آخر یہ اقبال تھا کون؟ سنیے:

اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء مطابق ۳ ذوالحجہ ۱۲۸۹ھ قمری کو سیالکوٹ کے شہر میں جو پنجاب میں دریائے چناب کے قریب واقع ہے، پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد کشمیری برہمن تھے۔ دو صدی سے کچھ زیادہ عرصہ پہلے وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد بزرگوار شیخ نور محمد اکثر کشمیریوں کی طرح درویش مشرب تھے۔ علامہ اقبال نے سن بلوغ تک پہنچنے پر دینی اور دنیوی علوم حاصل کر لیے اور اس کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں گورنمنٹ کالج میں تعلیم پانے لگے۔ ان کے اساتذہ میں مولانا (میر) حسن اور ڈاکٹر آرنلڈ کا نام لیا جاتا ہے۔ لاہور میں ان کی تعلیم کا مخصوص موضوع فلسفہ تھا۔ اس کالج سے فارغ التحصیل ہونے پر وہ یورپ

---

[1] ۔ نئے ایرانی شعراء کا کلام ان کی نظر سے گزرا تھا، بلکہ وہ ان کے عروضی اجتہادات سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ پیام مشرق کی بعض نظمیں اسی تاثر کا نتیجہ تھیں۔ (مترجم)

چلے گئے[1] اور وہاں پہلے پہل کیمبرج میں، پھر ہائڈلبرگ اور مونیخ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔ اور مشرق اور مغرب کے فلسفہ و حکمت کی تکمیل کی اور انگریزی زبان میں "ایران میں علم مابعد الطبیعات کی ترقی" کے موضوع پر کتاب لکھی جو چھپ چکی ہے[2]۔ یہاں وہ جن یورپین فلسفیوں، شاعروں اور مصنفوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں سے اوگسٹ کانٹ، شوپنہاور، نیٹشے، ہیگل، آئنسٹائن، گوئٹے اور ٹالسٹائی کے نام لیے جا سکتے ہیں[3]، جن سے انھیں شدید اختلاف بھی تھا اور انھوں نے ان کے خیالات کی پرزور تنقید بھی کی۔ اقبال طبعاً شاعر تھے اور ان کی تربیت فلسفہ و حکمت کے آغوش میں ہوئی تھی۔ اس لیے ایرانی شعراء میں جو لوگ ان کے ہم خیال اور ہم ذوق تھے، ان سے انھیں شغف رہا، جن میں مولانا روم کا خصوصیت سے تتبع بھی کیا۔ ان کے متعلق وہ کہتے ہیں:

مثنوی مولوی معنوی

ہست قرآن در زبان پہلوی

یورپ سے فارغ التحصیل ہونے پر وہ پنجاب لوٹ آئے اور یہاں آکر نثر و نظم کے ذریعے اپنے ہموطنوں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو درس بیداری دینا شروع کیا اور کوشش کی کہ تمام مسلمانان عالم کو عمل کی تلقین کریں اور انھیں ایک دوسرے سے متحد

---

[1] ۔ لندن جانے سے پہلے وہ گورنمنٹ کالج ہی میں کچھ عرصہ فلسفے اور انگریزی کے معلم بھی رہے۔ (مترجم)

[2] ۔ یہ کتاب پی ایچ ڈی کی ڈگری کے سلسلے میں پیش کی گئی تھی۔ (مترجم)

[3] ۔ فاضل مصنف نے یونہی بہت سے نام لکھ دیے ہیں۔ علامہ نے فلسفے کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے ان سب کا مطالعہ کیا تھا لیکن برگساں، نیٹشے اور گوئٹے کا انداز فکر انھیں مرغوب تھا۔ (مترجم)

کر دیں اور ساتھ ہی ان کی زندگی اور تمدن کو بلند تر بنا دیں۔ انھوں نے شروع شروع میں اردو زبان میں شعر کہے اور مقالے لکھے، لیکن چونکہ فارسی زبان سے خاص مزاولت تھی اس لیے اسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیا اور اردو کو اپنے مطالب کی تفہیم کے لیے ناکافی سمجھنے لگے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے خیالات کو تمام "عجم" یعنی ہندوستان، افغانستان، ایران، تاجیکستان اور ترکی کے مسلمان پڑھیں اور سمجھیں۔ فارسی زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی اس لیے فارسی ہی کو شعر کے لیے آلہ کار بنایا، اور اردو کو ترک کر دیا۔ البتہ آخری عمر میں اپنے بعض دوستوں کے اصرار پر کچھ اردو اشعار بھی کہے۔ ان کے فارسی اشعار کے جن میں قطعہ، دوبیتی، رباعی، غزل، مثنوی اور قصیدہ شامل ہیں، حسب ذیل مجموعے ہیں:

اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں

رموزِ بے خودی ۱۹۱۶ء میں

پیامِ مشرق ۱۹۲۳ء

زبورِ عجم بضمیمہ گلشن رازِ جدید

جاوید نامہ ۱۹۳۲ء

مسافر بضمیمہ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ۱۹۳۴ء

۱۹۲۴ء میں ان کے اردو اشعار کا مجموعہ شائع ہوا جس کا نام بانگِ درا ہے۔ اس مجموعے میں ان کے وہ اشعار شامل ہیں جو انھوں نے یورپ جانے سے پہلے یورپ کی اقامت (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء) اور پھر پنجاب میں آنے کے بعد کہے تھے۔ جب انھوں نے دوبارہ اردو کے شعر کہنے شروع کیے تو پھر دو کتابیں شائع کیں۔ ایک کا نام "بالِ جبریل" ہے اور دوسری کا "ضربِ کلیم"۔ تیسرا مجموعہ "ارمغانِ حجاز"

ان کی وفات کے بعد شائع ہوا جس میں ایک چوتھائی اردو اشعار ہیں اور باقی فارسی۔ ان کتابوں میں سے اسرار خودی انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس کے مترجم مرحوم پروفیسر نکلسن ہیں جنھوں نے مثنوی مولانا روم کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ نثر میں ایرانی علم مابعد الطبیعات کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب انگریزی میں ہے جس کا نام "تجدید بنائے الٰہیات اسلامیہ"[1] ہے۔ علاوہ بریں ان کے کچھ اور بھی مضامین اور مقالے ہیں جو انگریزی یا اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔

اقبال نے تریسٹھ سال کی عمر میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو (مطابق آخر فروردین ماہ یا اول اردی بہشت ۱۳۱۷) دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے سے سولہ مہینے پہلے وفات پائی۔ ان کے بعد ایک انجمن ان کے نام پر قائم کی گئی جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سبھی شامل تھے اور "کتاب خانہ۔ اقبال" کے نام سے ایک لائبریری کی بھی بنیاد رکھی گئی جو پبلک لائبریری سے ملحق ہے۔

میں نے جب تک علامہ محمد اقبال کی تصنیفات و تالیفات کا مطالعہ نہیں کیا تھا، مجھے معلوم نہ تھا کہ مسلمانان ہند ان کے بارے میں اس قدر غلو کیوں کرتے ہیں۔ اب جب کہ مجھے ان کے کلام سے آشنا ہونے کا موقعہ ملا ہے، مجھے ان کی عقیدت کی صحیح وجہ معلوم ہو گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس عقیدت میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں بلکہ یہ عقیدت بالکل بجا ہے۔ علامہ ایک قادر الکلام شاعر اور بلند فکر فلسفی تھے۔

---

[1] Reconstruction of Religious Thought in Islam - علامہ مرحوم کے ان چھ مقالوں پر مشتمل تھی جو انھوں نے ۱۹۲۸ء میں مدراس میں پڑھے تھے۔ بعد میں ایک اور مقالے کے اضافے کے ساتھ (Is Religion Possible ?) جو لندن میں پڑھا گیا اس نام سے شائع ہوئی۔ علامہ اقبال اسے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کہتے تھے۔ (مترجم)

ان کے کلام میں مستعدی، جوش اور زندگی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ یہ بات دوسروں میں بھی پیدا ہو اور دوسرے لوگ بھی زندگی کے حقیقی معنوں سے آشنا ہو جائیں۔ ان کے کلام میں اس قدر تاثیر و قوت ہے کہ رسالت کا دعویٰ کیے بغیر آج لاکھوں نفوس انھیں نبی تو نہیں مانتے لیکن ان کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جیسے کسی نبی یا پیغمبر کے پیروکار کیا کرتے ہیں۔ آج اہلِ ہند میں آزادی کا ذوق و شوق اور مسلمانانِ ہند میں ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کا جذبہ زیادہ تر علامہ موصوف ہی کی سیاسی تعلیمات کا مرہونِ منت ہے۔ جب ہم ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو ایران میں گزشتہ ایک سو سال کے اندر ہمیں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جسے بحیثیت مجموعی علامہ اقبال کا مقابل کہا جا سکے۔ ممکن ہے دوسرے مشرقی ممالک کا بھی یہی عالم ہو، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ علامہ اقبال فقط ایک شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے اپنے عہد کے مروجہ علوم و فنون میں مہارت پیدا کی۔ وہ اپنی زبان میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے اور وہ انگریزی زبان میں بھی علمی اور فلسفیانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا پیشہ وکالت تھا وہ اجتماعی اور سیاسی معاملات میں بھی شریک ہوتے تھے اور انھوں نے ایک فلسفیانہ نظام یا طریق زندگی کی بھی بنیاد رکھی تھی، جس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتے تھے اور اس ضمن میں ان کے بہت سے پیروکار بھی پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ موصوف کی زندگی، ان کی تصنیفات، عقاید و تعلیمات پر بعض کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جن میں سے پانچ سات میں نے دیکھی اور پڑھی ہیں، یقیناً اتنی ہی اردو میں بھی لکھی گئی ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ علامہ اقبال کا بیشتر کلام فارسی میں ہے، اور اس بنا پر کبھی کبھی ان کے ہموطن ان سے گلہ اور شکایت بھی رکھتے تھے لیکن انھوں نے

اس اعتراض کا جواب بھی دیا ہے۔ ان سے پہلے غالب کشمیری[1] نے کہا تھا کہ میرا اردو کلام میرا بیرنگ کلام ہے، میرے اشعار کے نقش ہای رنگ رنگ دیکھنے ہوں تو فارسی میں دیکھیے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

اور اقبال فرماتے ہیں:

ہندیم از فارسی بیگانہ ام
ماہ نو باشم تہی پیمانہ ام
گرچہ ہندی در عذوبت شکّر است
طرز گفتار دری شیریں است
فکر من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخِ نخل طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
درخورد با فطرتِ اندیشہ ام

لیکن اُن کے نزدیک شاعری ایک نصب العین کے حصول کا ذریعہ تھی۔ یہ نصب العین کیا تھا؟ لوگوں کو اکسانا اور انھیں ایک بنیادی نظام فکر کے ماتحت

---

[1] ۔ غالب کے متعلق ان کے بعض مخالف معاصرین نے یہ بات مشہور کر دی تھی کہ وہ کسی کشمیری کا بیٹا ہے اور ان کی سرخی مائل گوری سفید رنگت سے کچھ لوگ اس بات کو ماننے پر بھی مائل ہو گئے تھے۔ لیکن یہ امر حقیقت حال کے خلاف ہے۔ معلوم نہیں کہ آقای مجتبیٰ مینوی کا یہ بیان ان افواہوں پر مبنی ہے یا انھیں فقط اشتباہ ہوا ہے۔ (مترجم)

متحد کرنا تھا:

نغمہ کجا و من کجا؟ ساز سخن بہانہ ایست
سوی قطار می کشم ناقۂ بی زمام را

شروع شروع میں وہ اس کام میں مصروف رہے کہ ہندوستانیوں کو بیدار کیا جائے اور انہیں نعمت آزادی کے حصول کی ترغیب دلائی جائے تاکہ وہ اطاعت و غلامی کے جوئے کو اتار کر پھینک دیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد ممکن نہیں۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر مسلمانان ہند کی ایک کنفرنس میں انھوں نے صدارت فرمائی اور انگریزی میں ایک خطبہ پڑھا جو چھپ چکا ہے۔ اس خطبے کا خلاصہ یہ تھا کہ ان تمام الگ الگ قوموں کو جو مسلمان ہو چکی ہیں، اپنی اپنی قومیت کے خیال کو دور کر دینا چاہیے اور پھر وحدتِ دینی پر اپنے اتحاد کی بنیاد رکھنی چاہیے۔ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کی کوئی امید باقی نہیں اس لیے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے، مسلم اور ہندو۔ یہ علامہ مرحوم کا بنیادی سیاسی عقیدہ تھا اور اسی عقیدے کے باعث وہ اپنی تمام شاعرانہ شکایتوں فریادوں اور دعوتوں میں جمیع مسلمانان عالم سے خطاب کرتے رہے اور اُن کا مطمح نظر ان مسلمانوں کے حالات سنوارنا اور انھیں اہلِ یورپ کے ظلم و تعدی سے نجات دلانا تھا۔ نظم "ساقی نامہ" میں جو "نشاط باغ کشمیر" میں لکھی گئی تھی، وہ فرماتے ہیں:

نبینی کہ از کاشغر تا بہ کاشان
ہمان یک نوا بالد از ہر دیاری
ز چشم اہم ریخت آن اشک نابی
کہ تاثیر اُو گل دماند ز خاری

اور وہ اس نظم میں ساقی سے یہ آرزو رکھتے ہیں کہ اس بادۂ جاں فروز کا ایک قطرہ

مرد کشمیری (یعنی کشمیری) پر گرے :

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتی می تراشد ز سنگ مزاری
ضمیرش تہی از خیال بلندی
خودی ناشناسی، ز خود شرمساری
برلیشم قبا خواجہ از محنت اُو
نصیب تنش جامۂ تارتاری
نہ در دیدۂ اُو فروغ نگاہی
نہ در سینۂ اُو دل بیقراری
از آن می فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شراری

یعنی فینکس[1] پرندے کی طرح کشمیری بھی اپنے آباو اجداد کی خاکستر سے اُبھرے گا اور چونکہ سرزمین کشمیر علامہ مرحوم کے آباو اجداد کا وطن تھی اور اس سے انہیں لگاؤ تھا، وہ اس سرزمین کے حسن و جمال اور یہاں کے رہنے والوں کی حالتِ زار کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اسی نظم میں لکھتے ہیں :

چہ شیرین نوای چہ دلکش صدای
کہ می آید از خلوت شاخساری
بتن جان، بجاں آرزو زندہ گردد
ز آوای ساری، ز بانگ ہزاری

---

[1] ۔ (ققنس) Phoenix

نواہای مرغ بلند آشیانی
درآمیخت بالغمۂ جوئیباری

توگوئی کہ یزدان بہشت برین را
نہادست در دامن کوھساری

کہ تا رحمتش آدمی زادگان را
رہا سازد از محنت انتظاری

چہ خواہم درین گلستان گر نخواہم
شرابی، کتابی، ربابی، نگاری

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر .
سبزہ جہاں جہاں بہین، لالہ چمن چمن نگر

باد بہار موج موج، مرغ بہار فوج فوج
سلسل وسار زوج زوج، بر سر نارون نگر

زخمہ بتار ساز زن، بادہ بساتگین بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

دختر کی برھمنی، لالہ رُخی ، سمن بری
چشم بروی اُوکشا، باز بہ خویشتن نگر

انہی اشعار میں جہاں وہ خطۂ کشمیر کے حال زار پہ روتے ہیں، وہ اس امید کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اس سرزمین کے رہنے والے کسی نہ کسی دن سربلند ہوں گے ۔ وہ جنیوا کی مجلسِ اقوام سے شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آؤ اور اس قوم کی داد رسی کرو :

جان ز اہل خطہ سوزد چون سپند
خیزد از دل نالہ ہای درد مند

زیرک و درّاک و خوشگل ملّتی است
در جہان تر دستیِ اُو آیتی است

شاعرش غدطندہ اندر خونِ اوست
در نیِ من نالہ از مضمونِ اوست

از خودی تابی نصیب افتادہ است
در دیارِ خود غریب افتادہ است

دست مزد اُو بدست دیگران
ماہیِ رودش بہ شست دیگران

کاروان ہا سوی منزل گام گام
کارِ او ناخوب و بی اندام و خام

تا نہ پنداری کہ بود است این چنین
جبہ را ہموارہ سود است این چنین

در زمانی صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جان باز و پردم بودہ است

کوہ ہای خنک سار اُو نگر
آتشیں دست چنار اُو نگر

کوہ و دریا و غروب آفتاب
من خدا دیدم در آنجا بی حجاب

بانسیم آوارہ بودم در نشاط
"بشنو از نی" می سرودم در نشاط

مرغکی می گفت اندر شاخسار
با پشیزی می نیرزد ایں بہار

نالۂ پر سوز آن مرغ سحر
داد جانم را تب و تاب دگر

تا یکی دیوانہ دیدم در خروش
آنکہ برد از من متاع صبر و ہوش

بگذر زما و نالۂ مستانہ ای مجوی
بگذر ز شاخ گل کہ طلسمی است رنگ و بوی

گفتی کہ شبنم از ورق لالہ می چکد
غافل دلی است ایں کہ بگرید کنار جوی

باد صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفی زما بہ مجلس اقوام باز گوی

دہقان و کشت و جوی و خیابان فروختند
قومی فروختند و چہ ارزاں فروختند

اس کے بعد وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور ہندوستان کے بارے میں شکایتاً کہتے ہیں:

شبی بہ میکدہ خوش گفت پیر زندہ دلی
بہر زمانہ خلیل است و آتش نمرود

چہ نقشہا کہ نبستم بکارگاہ حیات

چہ رفتنی کہ نرفت و چہ بودنی کہ نبود

بخاکِ ہند نوای حیات بی اثراست

کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمۂ داؤد

لیکن ان مایوس کن حالات کے باوجود بے کار نہیں بیٹھنا چاہیے :

بخواب رفتہ جوانان و مردہ دل پیران

نصیب سینۂ کس آہ صبحگاہی نیست

باین بہانہ بدشت طلب زپا منشین

کہ در زمانۂ ما آشنای راہی[1] نیست

بیا کہ دامن اقبال را بدست آریم

کہ اُو زخرقہ فروشان خانقاہی نیست

فلک زحل کی سیاحت کے ضمن میں وہ ایسی ارواح رذیلہ کو دیکھتے ہیں جنھوں نے ملک و ملت کے ساتھ غداری کی ہے اور دوزخ نے انھیں قبول نہیں کیا۔ ا ن میں سے ایک میر جعفر بنگالی ہیں جنھوں نے نواب سراج الدولہ سے بے وفائی کی اور دوسرے صادق دکنی ہیں جنھوں نے ٹیپو سلطان سے غداری کی تھی اور یہ انھی کے اعمالِ بد کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان غلام بن کر رہ گیا۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں :

می ندانی خطۂ ہندوستان   آن عزیز خاطر صاحب دلان

---

[1] ۔ یعنی بایں بہانہ کہ دراین زمان راہنمائی نیست نباید از طلب فرونشست (مصنف) معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو بظاہر اس شعر کی بندش میں کچھ اجنبیت نظر آتی تھی اس لیے اس نے اس کی نثری صورت بیان کر دی ہے۔ (مترجم)

خطہ ای سر جلوہ اش گیتی فروز درمیان خاک و خون غلطد ہنوز
در گِلش تخم غلامی راکہ کشت
این ہمہ کردارِ آن ارواح زشت

روح ہندوستان فریاد کرتی ہے کہ؛

شمع جان افسرد در فانوس ہند ہندیان بیگانہ از ناموس ہند
مردکی نامحرم از اسرار خویش زخمۂ خود کم زند بر تار خویش
بر زمانِ رفتہ می بندد نظر ز آتش افسردہ می سوزد جگر
بند ہا بر دست و پای من از وست نالہ ہای نارسای من از وست
خویشتن را از خودی پرداختہ از رسوم کہنہ زندان ساختہ
آدمیت از وجودش دردمند عصرِ نو از پاک و ناپاکش نژند
کی شبِ ہندوستان آید بروز
مُرد جعفر، روحِ او زندہ ہنوز

یہ گردش بتدریج شاعر کو کشمیر اور ہندوستان کی محبت سے اتحادِ اسلام کے مرحلے پر پہنچاتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک کے رہنے والے مسلمان ایک دوسرے سے مل جائیں اور مل کر اپنے دشمنوں کا مقابلہ کریں، ملک و نسل کے امتیاز کو مٹا دیں اور توحید و نبوت کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں، کیونکہ دین سب سے بڑا وطن ہے اور ملیت آب و خاک سے وابستہ نہیں ہوتی؛

عجم ہنوز نداند رموزِ دین ورنہ
ز دیو بند حسین احمد، این چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بی خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دین ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ان کا ایک اردو کا شعر ہے :

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس شعر نے اب ہندی مسلمانوں میں ترانۂ ملی کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس موضوع پر ہم بعد میں مزید بحث کریں گے۔

اقبال اپنے آپ کو ایک فارسی گو ہندی مسلمان سمجھتے ہیں :

تنم گلی ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

اگرچہ زادۂ ہندم فروغ چشم من است
ز خاک پاک بخارا و کابل و تبریز

وہ شعرا اپنے عہد و زمانہ کے رجحان کے مطابق کہتے ہیں :

من بہ طبع عصر خود گفتم دو حرف
کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف
حرف پیچاپیچ و حرف نیش دار
تا کنم عقل و دل مردان شکار
تا مزاج عصر من دیگر فتاد
طبع من ہنگامہ دیگر نہاد

اگر آج لوگ ان کے کلام کو نہیں سمجھتے تو کل سمجھیں گے :

انتظار صبح خیزان می کشم
ای خوشا زرتشتیان آتشم
عصر من دانندۂ اسرار نیست
یوسف من بہر این بازار نیست
ناامیدستم زیاران قدیم
طور می سوزد کہ می آید کلیم
پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
"جہانی را دگرگون کرد یک مردِ خود آگاہی"

نغمہ ام از زخمہ بی پرواستم   من نوای شاعر فرداستم

اُن کا مخاطب عجم ہے، یعنی غیر عرب کی تمام مسلمان قومیں، خواہ وہ فارسی بولتی ہوں یا اردو یا ترکی:

چون چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
ای جوانان عجم جان من و جان شما
غوطہ ہا زد در ضمیر زندگی اندیشہ ام
تا بدست آوردہ ام افکار پنہان شما
فکر رنگینم کند نذر تہی دستان شرق
پارۂ لعلی کہ دارم از بدخشان شما
می رسد مردی کہ زنجیر غلامان بشکند
دیدہ ام روزن دیوار زندان شما
حلقہ گرد من زنید ای پیکران آب و گل
آتشی در سینہ دارم از نیاگان شما

انھوں نے اپنے کلام کے نغموں سے سارے عجم کو اسیر بنالیا ہے اور ان لوگوں کے باہمی افتراق و تشتت کو اتحاد و یگانگت میں تبدیل کر دیا ہے :

عجم از نغمہ ہای من جوان شد
ز سودایم متاع او گران شد
ہجومی بود رہ گم کردہ در دشت
ز آواز درایم کاروان شد

عجم از نغمہ ام آتش بجان است
صدای من درای کاروان است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی
کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

لیکن تعجب یہ ہے کہ اقوام عرب نے ابھی اس کی آواز نہیں سنی :

نوای من بہ عجم آتش کہن افروخت
عرب ز نغمہ شوقم ہنوز بی خبر است

انھوں نے شعر کو لوگوں کی رہنمائی کا وسیلہ بنایا ہے اور وہ جس عشق و شوق کا اظہار کرتے ہیں وہی قدیم عشق و شوق ہے لیکن اس کا انداز تازہ ہے :

دلیل منزل شوقم بدامنم آویز — شرر ز آتش نامم بخاک خویش آمیز
عروس لالہ بروں آمد از سراپہ ناز — بیا کہ جان تو سوزم ز حرف شوق انگیز
بہر زمانہ باسلوب تازہ میگویند — حکایت غم فرہاد و عشرت پرویز

شعر اثر و سوز کا نام ہے اور شاعر کا مقصد حکمت کی نشر و اشاعت اور آدم گری ہے۔ مولانا روم کے قول کا ذکر کرتے ہیں :

گفت آن شعری کہ آتش اندراوست
اصل او از گرمی اللہ ھُوست

آن نوا گلشن کند خاشاک را
آن نوا برہم زند افلاک را

ای بسا شاعر کہ از سحر ہنر
رہزن قلب است و ابلیس نظر

زان نوای خوش کہ نشناسد مقام
خوشتر آں حرفی کہ گوئی در منام

فطرت شاعر سراپا جستجوست
خالق و پروردگار آرزوست

شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل
ملتی بی شاعری انبارِ گِل

سوز و مستی نقشبند عالمی است
شاعری بی سوز و مستی ماتمی است

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارث پیغمبری است

آسمانوں کی سیر کرتے ہوتے جب وہ شاعر ہندی بھرتری ہری کو افلاک کے اُس پار پاتے ہیں تو اُس سے شعر اور شعر کے سوز کے متعلق سوال کرتے ہیں؛

ای کہ گفتی نکتہ ہای دل نواز
مشرق از گفتار تو دانای راز

شعر را سوز از کجا آید، بگوی
از خودی یا از خدا آید، بگوی

اور پھر تری ہری جواب دیتے ہیں:

کس نداند در جہان شاعر کجاست — پردۂ اُو از بم و زیر نواست
آں دل گرمی کہ دارد در کنار — پیشِ یزدان ہم نمی گیرد قرار
جان ما را لذت اندر جستجوست — شعر را سوز از مقام آرزوست
ای تو از تاک سخن مست مدام — گر ترا آید میسر این مقام
با دو بیتی در جہان سنگ و خشت
میتواں بردن دل از حور بہشت

اقبال اپنے آپ کو صاحب درد شاعر سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کے دل میں بھی شوق و آرزو کا جوش و خروش پیدا ہو۔ جو شاعر درد نہیں رکھتے اور دوسروں کے دکھ سے متاثر نہیں ہوتے، اقبال ان کے مخالف ہیں:

از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست
پیش محفل جز بم و زیر و مقام و راہ نیست
در نہادم، عشق با فکر بلند، آمیختند
نا تمام جاودانم، کار من چو ماہ نیست
جرہ شاہینی، بمرغان سرا صحبت مکن
خیز و بال و پر کشا، پرواز تو کوتاہ نیست
کرم شب تاب است شاعر در شبستان وجود
در پر و بالش فروغی گاہ ہست و گاہ نیست

در غزل اقبال احوال خودی را فاش گفت

زانکہ این نو کافر از آئین دیر آگاہ نیست

ان کے مضمون دوسروں سے عاریتاً نہیں لیے گئے۔ جب کوئی تازہ مضمون اُن کے خیال میں آتا ہے تو ان کا دل تڑپ اُٹھتا ہے:

خیالم کو گل از فردوس چیند
چو مضمون غریبی آفریند
دلم در سینہ می لرزد چو برگی
کہ بروے قطرۂ شبنم نشیند

وہ کبھی کبھی شعرائے قدیم کے کسی مضمون کو لے کر اس میں تصرف کو کام میں لاتے ہیں اور اس سے ایک نیا اور تازہ شعر وجود میں آتا ہے۔ ذیل کی حکایت کی طرح گو فی الاصل سعدی کی ہے اور ناظرین اس سے آشنا ہیں:

مرا معنیِ تازہ ای مدّعاست — اگر گفتہ را باز گویم رواست
"یکی قطرہ باراں ز ابری چکید — خجل شد چو پہنای دریا بدید
کہ جای کہ دریاست من کیستم — گر اوہست حقا کہ من نیستم"
ولیکن ز دریا بر آمد خروش — ز شرم تنک مایگی رو مپوش
تماشای شام و سحر دیدہ ای — چمن دیدہ ای، دشت و در دیدہ ای
ز موج سبک سیر من زادہ ای — ز من زادہ ای در من افتادہ ای
بیا سای در خلوت سینہ ام — چو جوہر درخش اندر آئینہ ام

گہر شو در آغوش قلزم بزی
فروزاں تر از ماہ و انجم بزی

وہ قدیم شعراء بالخصوص صوفیاء کے، جنھوں نے ترکِ دنیا کیا اور اپنے نفس کو مارا، مخالف

تھے۔ "اسرارِ خودی" میں پیغمبر گوسفنداں کے قول کے سلسلے میں اس شعر کو نقل کرتے ہیں جو صوفیاء کے عقیدے کا آئینہ دار ہے:

چشم بند و گوش بند و لب ببند
تا رسد فکر تو بر چرخ بلند

اقبال فرماتے ہیں:

چشم و گوش و لب کشا ای ہوشمند
گر نبینی راہ حق، بر من بخند

مولوی رومی کا ایک شعر ہے جس کا اطلاق یہاں صحیح طور پر ہوتا ہے۔ ایک زاہد گناہ نصوح سے آگاہ ہے لیکن وہ اس کے راز کو فاش نہیں کرتا۔ صوفیاء اس شعر کو لے کر اپنی خاموشی کو جو غالباً جہل کا نتیجہ ہے، حسب ذیل شعر کی صورت میں بطور مقولے کے پیش کرتے ہیں:

ہر کرا اسرار کار آموختند
مُہر کردند و دہانش دوختند

لیکن اقبال فرماتے ہیں کہ جب کسی کو آگاہی کا نور حاصل ہو تو اسے چاہیے کہ اسے ہویدا کر دے:

تا مرا رمز حیات آموختند
آتشی در پیکرم افروختند

پک نوای سینہ تاب آوردہ ام
عشق را ہم عہد شباب آوردہ ام

وہ مشرقی تصوف اور قدیم عقلی فلسفہ جو حکمت افلاطون سے سیراب ہوا ہے، دونوں کو تمدن کی تیز رفتاری سے پیچھے رہ جانے کا سبب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا

کو حقیر نہیں کہنا چاہیے بلکہ اُسے اپنی ذات کی وسعت اور ارتقائے نفس کا ذریعہ بنانا چاہیے ؛

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر
تختۂ تعلیم ارباب نظر

ای کہ از تاثیر افیون خفتہ ای
عالم اسباب را دون گفتہ ای

خیز و واکن دیدۂ مخمور را
دون مخوان این عالم مجبور را

غایتش توسیع ذات مسلم است
امتحان و ممکنات مسلم است

گیر او را تا نہ او گیرد ترا
ہمچو می اندر سبو گیرد ترا

تا ز تسخیر قوای این نظام
ذوفنونی ہای تو گردد تمام

تا تب حق در جہان آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود

یہاں تک کہ موت کی آرزو کرنا اور اس دنیا کی زندگی سے دل اُٹھا لینا بھی جائز نہیں ؛

سخن از بود و نابود جہاں با من چہ میگوئی
من این دانم کہ من ہستم ندانم این چہ نیرنگ است

کہن شاخی کہ زیر سایہ او پر بر آوردی
چو برگش ریخت از وی آشیان برداشتن ننگ است

ایران[1] کے تمام شاعروں میں سے اُنھوں نے ایک اپنا استاد اور مرشد انتخاب کر لیا ہے اور وہ مولانا روم ہیں :

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

ذرہ از خاک بیابان رخت بست
تا شعاع آفتاب آرد بدست

---

[1] ۔ مولانا روم بلخ میں پیدا ہوتے اور روم یعنی ایشیائے کوچک کے شہر قونیہ میں زندگی گزاری اور وہیں ان کی شاعری کی نشوونما ہوئی ۔ مولد و منشا کے اعتبار سے انھیں سرزمین ایران سے بالواسطہ نسبت تھی ۔ اور وہ بھی بقول مرزا غالب "واں کے نہیں تو واں کے نکالے ہوئے تو ہیں" دور کی نسبت تھی ۔ ابھی اُن کا بچپن ہی تھا کہ ان کے والد بہاؤ الدین ولد کو علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے ملک سے بدر کر دیا تھا ۔ ان تمام حالات کے پیش نظر اُنھیں رومی ہی کہنا درست ہے اور اسی نام سے وہ جائز طور پر مشہور بھی ہیں ۔ لیکن جیسا کہ دستور ہے ان کی عظمت اور شہرت کے باعث ایران اور اہل ایران انھیں اپنی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ، بالخصوص جب کہ ان کی مثنوی کی زبان بھی فارسی ہے ۔ یہی حال البیرونی اور جمال الدین افغانی کا ہے ۔ یونان کے شاعر ہومر کی شہرت دوام کے باعث اب بہت سے شہر اُن کے مدفن ہونے کے مدعی ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ انہی شہروں میں ، جب وہ زندہ تھا تو نانِ شبینہ کو ترستا تھا ۔ (مترجم)

موجم و در بحر او منزل کنم | تا در تابندہ ای حاصل کنم
من کہ مستی ها ز صہبایش کنم | زندگانی از نفسہایش کنم

اور پھر کہتے ہیں:

روی خود بنمود پیر حق سرشت | کہ بحرف پہلوی قرآن نوشت
گفت "ای دیوانۂ ارباب عشق | جرعہ ای گیر از شراب ناب عشق"

وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ رموز مولوی روم سے آشنا ہیں:

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ ای رمز آشنای روم و تبریز است

بیا کہ من ز خم پیر روم آوردم
می سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی است

ایک جگہ وہ مولانا روم کے ایک قول کو نقل کرتے ہوئے اُن کا ذکر یوں کرتے ہیں:

مرشد رومی حکیم پاک زاد | سر مرگ و زندگی بر ما کشاد
ہر ہلاک اُمت پیشین کہ بود | زان کہ صندل را گمان بردند عود

ایک اور مقام پر حکمت و شعر کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بو علی اندر غبار ناقہ گم | دست رومی پردۂ محمل گرفت
این فروتر رفت تا گوہر رسید | آن بگردابی چو خس منزل گرفت
حق اگر سوزی ندارد حکمت است | شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

جاوید نامے میں جہاں وہ آسمانوں کی سیر کرتے ہیں اور ارواح رفتگاں کو دیکھتے ہیں، اُن کے رہنما بھی ہر جگہ مولانا روم ہی ہیں۔ کتاب کے آخیر میں وہ اپنے فرزند، جاوید کو یوں خطاب کرتے ہیں:

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

زانکہ رومی مغز را داند ز پوست
پای او محکم فتد در کوی دوست

شرح او کردند و او را کس ندید
معنی او چوں غزال از ما رمید

رقص تن از حرف او آموختند
چشم را از رقص جان بر دوختند

رقص تن در گردش آرد خاک را
رقص جان برہم زند افلاک را

علم و حکم از رقص جان آید بدست
ہم زمین، ہم آسمان، آید بدست

باوجود اس کے کہ علامہ موصوف صوفیاء کے طرزِ زندگی اور عمل کے مخالف تھے، اُن کے بعض افکار اور اصول و عقاید میں قدیم بزرگوں کے عرفان و تصوف کی چاشنی ہے۔ انھی میں سے ایک مسئلہ اصل وحدت وجود کا ہے کہ صوفیاء اُسے لفظ "اتحاد" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دنیا و مافیہا میں جز خدا کچھ بھی نہیں۔ اس اعتبار سے ہر ایک خدا بھی ہے اور یہی وجہ تھی کہ حسین بن منصور حلاج نے انا الحق کہا تھا۔ اقبال کو بھی یہ اصول قبول ہے مگر اس میں یہ فرق ہے کہ صوفی کہتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو مٹا دے اور خدا میں گم ہو جائے لیکن وہ فرماتے ہیں انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو پہچانے اور اپنی خودی پر غور و تعمق کرے اور اپنی ذات کی تربیت کرے اور اسے وسعت دے کر

اس قابل بنا لے کہ زمین پر خدا کا نائب اور سایۂ خدا بن جائے اور خدا کو اپنے آپ میں جذب کرلے اور اس کے ساتھ ایک ہو جائے :

کرا جوئی ؟ چرا در پیچ و تابی ؟
کہ اُو پیداست تو زیر نقابی
تلاش اُو کنی، جز خود نبینی
تلاش خود کنی، جز اُو نیابی

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

چناں باذات حق خلوت گزینی
ترا اُو بیند و اُو را تو بینی
بخود محکم گزار اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحر نورش

اس موضوع پر ہم بعد میں بحث کریں گے ۔

اُن کا اعتقاد یہ ہے کہ مختلف قوموں میں کوئی باہمی اختلاف نہیں، سب کی سب آدم کی اولاد ہیں :

ہنوز از بند آب و گل نرستی
تو گوئی، رومی و افغانیم من
من اول آدم بی رنگ و بویم
از آن پس ہندی و تورانیم من

اور جو لوگ ان اختلافات کو پیدا کرتے ہیں وہ بت گر اور بت تراش ہیں، اور اس بت کے سامنے انسانیت کو قربان کرتے ہیں :

فکر انسان، بت پرستی، بتگری ہر زمان در جستوی پیکری

باز طرح آذری انداخت است | تازہ تر پروردگاری ساخت است
کاید از خون ریختن اندر طرب | نام او رنگ است وہم ملک ونسب
آدمیت کشتہ شد چون گوسفند | پیش پای این بت ناارجمند
آن فلارناوی[1] باطل پرست | سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخہ ای بہر شہنشاہان نوشت | در گل ما دانۂ پیکار کشت
بتگری مانند آذر پیشہ اش | بست نقش تازہ ای اندیشہ اش
مملکت را دین او معبود ساخت | فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پای آن معبود زد | نقد حق را بر عیار سود زد

ہم نہیں چاہتے اس مرد فہیم اور شاعر قادر الکلام پر نکتہ چینی کریں لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ چونکہ ہمارا شاعر اپنے خیالات پر فریفتہ تھا اس نے یہ نہیں دیکھا کہ جو کچھ وہ ماکیاولی اور دوسروں کے بارے میں کہتا ہے۔ خود اس پر بھی

---

[1] Niccolo (Machiavelli) فلارنس (اٹلی) کا ایک مشہور مدبر سیاست اور مؤرخ (۱۴۶۹ء - ۱۵۲۷ء) عرصے تک فلورنس کے جمہوریہ کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں رہی اور وہ حکومت کے سیاہ وسفید کا مالک رہا۔ سیاست میں اس کے خاص نظریات تھے جو اس نے مشہور ومعروف تصنیف "The Prince" میں لکھے ہیں۔ وہ سیاست وحکومت کو برقرار رکھنے کے لیے تشدد کا بھی قائل تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر حکومت کے استحکام کے لیے دینی اور اخلاقی اقدار کو بھی قربان کرنا پڑے تو مضائقہ نہیں۔ یورپ میں مدت مدید تک اس کی تصنیف مقبول رہی اور اب بھی تاریخ سیاسیات میں اس کا خاص رتبہ ہے۔ (مترجم)

وارد ہوتا ہے[1]۔ اگر ان لوگوں نے رنگ، نسل یا نسب یا ملک کو اپنا معبود بنایا ہے اور اس سلسلے میں جنگ اور خونریزی کو جائز سمجھتے ہیں تو اقبال بھی جیسا کہ ہم نے دیکھا اور آئندہ بھی دیکھیں گے، ملت یعنی دین اسلام کو اپنا معبود مانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پیروان دین باہم متحد ہو جائیں اور اپنے مخالفین کے ساتھ جنگ کریں۔ وکل حزب بما لدیھم فرحون

آگے چلیے۔ ایک اور بات، جہاں وہ صوفیا۔ کی پیروی کرتے ہیں یہ ہے کہ انسان عشق سے ممتاز ہے اور عاشق کا مذہب کچھ بھی ہو، دوست تک پہنچتا ہے:

دماغم کافر زنار دار است　　بتان را بندہ و پروردگار است
دلم را بین کہ نالد از غم عشق　　ترا با دین و آئینم چہ کار است

دی کافر کی دیدم در وادیِ بطحا مست

از حرف دلاویزش اسرار حرم پیدا
مرنج از برہمن ای واعظ شہر
گر از ما سجدہ ای پیش بتان خواست

---

[1] - یہاں مجھے مصنف سے شدید اختلاف ہے۔ ماکیاولی کی روح سیاست، اقبال کے سیاسی تصورات کی ضد ہے۔ اقبال سیاسیات کو دین اور اخلاق کے بلند اقدار کے تابع سمجھتا ہے بلکہ ان کے استحکام کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی سیاسی نظریہ یا لائحہ عمل ان کے منافی ہو تو غلط ہوگا۔ اسلامی نقطہ نظر سے دین اور سیاست ایک ہیں؛ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ پھر اقبال اس تشدد کا حامی بھی نہیں جس کا پرچار ماکیاولی نے کیا ہے۔ (مترجم)

خدای ما کہ خود صورتگری کرد

بتی را سجدہ ای از قدسیاں خواست

درعشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست

آں تیشۂ فرہادی، این حیلۂ پرویزی

اس عشق کے مقابلے میں عقل و فہم عاجز اور بیکار ہیں ۔ جس طرح ابن سینا اور مولوی رومی کا مقابلہ کرتے ہوتے کہا تھا، اسی طرح ان دو قطعوں میں علم و عشق کا مکالمہ ہے ۔ علم کہتا ہے مجھے مافوق الفطرت سے غرض نہیں، میرا تعلق اس دنیا سے ہے اور بس :

نگاہم رازدار ہفت و چار است　　گرفتار کمندم روزگار است

جہان بینم باین سو باز کردند　　مرا باآں سوِ گردوں چہ کار است

چکد صد نغمہ از سازی کہ دارم

ببازار افگنم رازی کہ دارم

اور عشق جواب میں کہتا ہے کہ علم اگر عشق کے ہمراہ نہ چلے تو گمراہ ہو جاتا ہے :

زافسون تو دریا شعلہ زار است　　ہوا آتش گداز و زہردار است

چو بامن یار بودی نور بودی　　بریدی از من و نور تو نار است

بخلوت خانۂ لاہوت زادی

ولیکن در نخ شیطان فتادی

ان شعروں سے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ممکن ہے علم ابتدا میں انسان کی مدد کرے لیکن آخر کار منزل مقصود پر پہنچانے والا عشق ہی ہے :

علم را مقصود اگر باشد نظر　　میشود ہم بادہ و ہم راہبر

علم تفسیر جہان رنگ و بو　　دیدہ و دل پرورش گیرد ازو
بر مقام جذب و شوق آرد ترا　　باز چون جبریل بگذارد ترا
علم کس را کی بہ خلوت میبرد　　او ز چشم خویش غیرت میبرد

اوّلِ اُو ہم رفیق و ہم طریق
آخرِ او راہ رفتن بی رفیق

می نداند عشق سال و ماہ را
دیر و زود و نزد و دور راہ را
عقل در گوہر شکافی میزند
یا بگرد او طوافی میزند
کوہ پیش عشق چون کاہی بود
دل سریع السیر چون ماہی بود
عشق شبخونی زدن بر لامکان
گور را نادیدہ رفتن از جہان
عشق با نان جوین خیبر کشاد
عشق در اندام مہ چاکی نہاد
چون خودی را از خدا طالب شود
جملہ عالم مرکب، او راکب شود

علم و عقل و خبر سے ظاہر کی تعمیر ہوتی ہے۔ لیکن عشق ظاہر کو ویران کرتا ہے تاکہ باطن کو آباد کرے، جسم کو تابع کرتا ہے تاکہ روح آزاد ہو:

ہر کہ پیمان با ھُو الموجود بست
گردنش از بند ہر معبود رست

مؤمن از عشق است و عشق از مؤمن است
عشق را ناممکن ما، ممکن است

عقل سفّاک است و او سفّاک تر
پاک تر، چالاک تر، بے باک تر

عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگان باز میدانِ عمل

عشق صید از زور بازو افگند
عقل مکّار است و دامی مینهد

عقل را سرمایه از بیم و شک است
عشق را عزم و یقین لاینفک است

آن کند تعمیر تا ویران کند
این کند ویران کہ آبادان کند

عقل چون باد است، ارزان در جهان
عشق کمیاب و بهای او گران

عقل محکم از اساس چون و چند
عشق عریان از لباس چون و چند

عقل میگوید کہ خود را پیش کن
عشق گوید امتحان خویش کن

عقل گوید شاد شو، آباد شو
عشق گوید بنده شو، آزاد شو

عشق را آرام جان، حریت است
ناقہ اش را ساربان، حریت است

سرزمین مغرب کے صاحب نظروں اور مشرق کے صاحب دلوں میں جو واضح فرق ہے وہ یہ ہے کہ مشرقی لوگ عشق و نظر[1] کو اہمیت دیتے ہیں اور اہل مغرب عقل و خبر[2] کی طرف مائل ہیں:

نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس
بیا کہ عشق کمالی ز یک فنی دارد
فرنگ گرچہ سخن با ستارہ میگوید
حذر کہ شیوۂ او رنگ چوزنی دارد

مشرقیوں کے اس طریق کو مغربیوں کی روش پر ترجیح دیتے ہوئے وہ مولوی رومی کا قول پیش کرتے ہیں:۔

شرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید از حق رمید
چشم بر حق باز کردن بندگی است
خویش را بی پردہ دیدن زندگی است

ترکی کے فاضل وزیر سعید حلیم پاشا کا قول یوں پیش کرتے ہیں:

غربیان را زیرکی ساز حیات — شرقیان را عشق راز کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چون با زیرکی ہم بر شود — نقشبند عالم دیگر شود

---

[1] Intuition -

[2] Intellect -

خیز و نقش عالم دیگر بنہ عشق را با زیرکی آمیزدہ

سرزمین مغرب کا بڑا عیب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ عشق و قلب و ایمان کے معاملات کو یکسر مہمل سمجھتے ہیں :

دل بیدار ندادند بدانائے فرنگ
ایں قدر ہست کہ چشم نگران دارد

از من ای بادِ صبا گوی بدانائے فرنگ
عقل تابال کشودہ است گرفتار تراست
برق را این بجگر میزند، آن رام کند
عشق از عقل فسون پیشہ جگر دار تراست
عجب آن نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب آن است کہ بیمار تو بیمار تراست
دانش اندوختہ ای، دل زکف انداختہ ای
آہ ازان نقدِ گراں مایہ کہ در باختہ ای

اس وقت سرزمین مشرق، عشق و شوق و آرزو کو بالکل فراموش کر چکی ہے اور مغرب میں لوگ دنیاوی امور میں اسیر اور مشرق کے ملک و مال کو لوٹنے کے درپے ہیں۔ اس اعتبار سے مشرق و مغرب دونوں ویران ہو گئے ہیں :

خاور کہ آسمان بکمند خیال اُوست
از خویشتن گسستہ و بی سوز آرزوست
در تیرہ خاک اُو بت و تاب حیات نیست
جولانِ موج را نگران از کنارِ جوست

بتخانہ و حرم ہمہ افسردہ آتشی
پیر مغان شراب ہوا خوردہ در سبوست
فکر فرنگ پیش مجاز آورد سجود
بینای کور دست تماشای رنگ و بوست

گردندہ تر ز چرخ و ربایندہ تر زمرگ
از دست او بدامن ما چاک بی رفوست
مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بی ذوق جستجوست

فی الحقیقت انسان اہلِ مغرب کی عقل اور اہلِ مشرق کے عشق۔ دونوں سے فیض یاب ہوتا ہے:

خرد افزود مرا درس حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

ممکن ہے پڑھنے والے کو خیال ہو کہ اگر علامہ اقبال چند اعتبار سے صوفیاء کے ہم عقیدہ ہیں تو پھر اُن سے اختلاف کی کیا صورت ہے؟

انھوں نے اس سوال کا جواب خود ہی اپنی کتاب "تجدید بنای الہیات اسلام"[1] میں دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"جب انسان اپنے اعمال کی بنیاد دینی تعلیمات و عقاید پر رکھے تو اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ دل سے ان تعلیمات اور عقاید پہ ایمان بھی رکھتا ہو اور اس میں ایسا باطنی انقلاب

---

[1] - Reconstruction of Religious Thought in Islam

اور تبدیلی پیدا ہو کر اسے حقیقی دیندار بنا دے۔ قدیم صوفیاء نے اپنے خلوص کی بنا پر جب طریقت و سلوک کی بنیاد ڈالی تھی تو بلاشبہ انھوں نے مسلمانوں میں اسی قسم کا باطنی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اس زمانے میں انسان اس قدر ظاہر پرستی کا خوگر ہو گیا ہے کہ اس کے افکار میں انقلابِ روحانی اور تحوّلِ باطنی کے قبول کرنے کی وہ صلاحیت نہیں رہی جو قدیم الایام میں تھی۔ اس وقت تصوف کے جو مختلف گروہ باقی ہیں وہ اس دور کے لوگوں کے ذہنی حالات سے ناواقف ہیں اور ان میں اتنی استعداد نہیں کہ وہ افکار جدید کو اخذ کر سکیں اور عہد حاضر کے لوگوں کے مسائل کو سمجھ سکیں اور ان دوسر چشموں سے اپنی سیرت صوفیانہ اور طریق عارفانہ کو تقویت پہنچا سکیں۔ یہ لوگ ابھی تک ہمارے اسلاف کے قدیم طریقوں پر کاربند ہیں اور نہایت استقامت کے ساتھ کاربند ہیں، حالانکہ ہمارے اسلاف کا طرزِ فکر اور تہذیبی انداز کئی ایک اعتبار سے ہمارے طرز فکر اور تہذیبی انداز سے بہت مختلف ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام کے دینی فلسفے کو اس طرح از سر نو وضع کریں کہ وہ ایک طرف اسلامی فلسفیانہ طریق پر حاوی بھی ہو اور دوسری طرف ان تمام انقلابات اور وسعتوں کے مطابق بھی ہو جو انسانی علم و معرفت کی گوناگوں ترقیوں کے سلسلے میں واقع ہوتی ہیں۔"

آپ کہیں گے کہ پھر یورپ کے علماء اور حکماء سے اقبال کی اصل نزاع کیا ہے؟

اصل نزاع یہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں علم طبیعیات ایسے مرحلے پر پہنچ چکا تھا کہ علماء کی نظر صرف مادہ اور فطرت پر ہی پڑتی تھی اور وہ دین کو قطعی طور پر چھوڑ چکے تھے، اور انھیں اس ذوق و شوق سے جو انسانی دلوں میں پیدا ہوتا ہے مطلق آشنائی نہ تھی۔ لیکن علامہ اقبال کی زندگی کے اسی دور میں علم طبیعیات کے ماہرین نے اپنے علم کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کیا اور وہ مادہ پرستی جو لازمی طور پر ان میں پیدا ہو گئی تھی، دور ہونے لگی اور عنقریب اب ایسا موقع بھی آئے گا کہ دین اور سائنس میں ایک ایسا اشتراک پیدا ہو جو ابھی تک انسانی ذہن کے تصور میں نہیں آیا، اور ان میں یکسر موافقت کا رنگ آجائے۔ ساتھ ہی یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ فلسفی کے خیالات کبھی بھی حد یقین تک نہیں پہنچتے۔ جوں جوں علم ترقی کرتا جائے گا انسانی افکار کے لیے نئی نئی راہیں کھلتی جائیں گی۔ اور اس ضمن میں مختلف رائیں اور نظریے وضع ہوتے رہیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہمیشہ فکر انسانی کی ان تبدیلیوں اور ترقیوں کا بغور مطالعہ کریں اور ان کا انتقادی طور پر جائزہ بھی لیتے رہیں:

ہمای علم تا افتد بدامت
یقین کم کن، گرفتار شکی باش

یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال کو شعراء و حکمائے فرنگ میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا کہ وہ اس پر تنقیدی نظر نہ ڈالتے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا اُن میں سے بعض کے نام وہ نہایت احترام سے لیتے ہیں، مثلاً باترن، کانٹ، ہیگل، نٹشے، ٹالسٹائی، شوپنہاور، آئنسٹائن، برگسان اور کبھی کبھی اُس تاثر کو ظاہر کرنے کے لیے جو اُن لوگوں کے بارے میں ان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، وہ ایک ایک دو دو شعر اُن کی تعریف میں بھی لکھتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جلال الدین رومی

بلخی یعنی مولوی معنوی وہاں موجود ہیں اور ان تمام بڑی بڑی ہستیوں پر تنقید کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یورپ کا فقط ایک فلسفی شاعر تھا جسے وہ ارادت و عقیدت کے قابل سمجھتے ہیں، اور وہ گوئٹے المانی تھا۔ گوئٹے کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ وہ مولوی رومی کی طرح:

نیست پیغمبر ولی دارد کتاب

لیکن فقط گوئٹے کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو گوئٹے بھی عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے۔ دوسرے اس نے شرق و غرب کے افکار و اقوال میں موافقت پیدا کی ہے اور انھیں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ گوئٹے کی تصنیف فاؤسٹ[1] ایک فلسفی کی داستان ہے جو پہلے عقل کے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور یہ راہ چلتے چلتے وہ گمراہ ہو گیا اور شیطان کا مرید بنا اور اس سے یہ عہد و پیمان باندھا کہ بیس سال تک میری آرزوئیں پوری کرو۔ اس کے عوض میری روح تمہاری ہوگی۔ جب بیس سال پورے ہوتے اور ابلیس اس کی روح لینے کے لیے آیا تاکہ اُسے دوزخ میں لے جائے تو وہ فلسفی راضی نہ ہوا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس اثنا میں فاؤسٹ میں خدمت خلق کے لیے شدید عشق پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اس دُھن میں اندھا ہو گیا اور عشق نے اُسے ابلیس کے پنجے سے نجات دلائی۔

گوئٹے کی تصنیف "دیوان غربی و شرقی" ہے جو اس کے غزلیہ اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ دیوان خود جرمنی میں بھی عوام میں مقبول نہیں ہوا۔ لیکن بعض بڑی بڑی ہستیاں اسے بے حد پسند کرتی ہیں۔ ان میں سے جرمنی کا شاعر بزرگ ہیگل ہے جس نے اپنی بعض غزلیات میں اس کا تتبع کیا ہے۔ ہیگل گوئٹے کے دیوان کے بعض اشعار سے سخت متاثر تھا۔ اُسے حیرت ہوتی تھی کہ جرمن زبان میں ایسے لطیف و روان

---

[1] Edward Dowden -

اشعار کہنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے ۔ اڈورڈ ڈاوڈن[1] نے جو انگلستان کا ایک بڑا فاضل ادیب اور محقق ہے ، اس دیوان کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے اور اُسے نظم میں بھی سمویا ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال نے اپنی کتاب "پیام مشرق" گوئٹے کے "دیوان مغربی" کے مقابلے میں لکھی تھی ، جس میں اس نے مشرق و مغرب کے وہ افکار و اقوال جمع کر دیے ہیں جن سے وہ متاثر ہوئے یا جوان کی اپنی تراوش طبع کا نتیجہ تھے ۔[2]

علامہ اقبال سرزمین مغرب کے فلسفیوں اور مفکرین کا بہت احترام کرتے ہیں اور مغرب کے علم اور حکمت اور فلسفہ کے مطالعے کو مشرقیوں کے لیے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں ، لیکن اس کے باوجود ان کا عقیدہ ہے کہ اہلِ مشرق کے لیے نجات کا یہ راستہ نہیں اس لیے کہ فلسفہ و حکمت عشق سے عاری ہے :

حکمت و فلسفہ کاریست کہ پایانش نیست
سیلیِ عشق و محبت بدبستانش نیست
دشت و کہسار نوردید و غزالی نگرفت
طوفِ گلشن زد و یک گل بگریبانش نیست
چارہ اینست کہ از عشق کشادی طلبیم
پیش اُو سجدہ گزاریم و مرادی طلبیم

---

[1] ۔ ڈاوڈن آئرلینڈ کا ایک مشہور شاعر اور نقاد تھا ۔ اس نے انگریزی ادب پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں "حیات شیلے" خصوصیت سے قابل ذکر ہے ۔

[2] ۔ پیام مشرق کے دیباچے میں علامہ اقبال نے اس امر کی تصریح بھی کر دی ہے اور گوئٹے کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے اس کے بعض تصورات و احساسات کو سراہا بھی ہے ۔ (مترجم)

عقل کو چاہیے کہ وہ عشق و آرزو سے وابستہ رہے :

ای خوش آن عقل کہ پہنای دو عالم با اوست
نور افرشتہ و سوز دل آدم با اوست

یورپ کے مشرق شناس پرانے دیوتاؤں کو زندہ کرتے ہیں اور ہمیں ان کی پوجا کرنے پر اکساتے ہیں۔ یہ لوگ ہماری گمراہی کا باعث ہیں :

اہرمن را زندہ کرد افسون غرب
روز یزدان زرد رُو از بیم شب

کنعان اور فنیقیہ کا خدائے قدیم "بعل" نغمہ گاتے ہوئے کہتا ہے :

زندہ باد افرنگیِ مشرق شناس
آنکہ ما را از لحد بیرون کشید

اس لیے اہل مشرق کو یورپ کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ مناسب یہی ہے کہ اُن لوگوں کے اقوال و اعمال کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ اس میں سے جو اچھی شے ہو وہ لے لی جائے اور اُن کے تمدن کے ظاہری ٹھاٹھ سے جس میں رقص، بے دینی، خط لاطینی، مختصر لباسی شامل ہیں، دھوکا نہ کھائیں[1] :

شرق را از خود برد تقلید غرب
باید این اقوام را تنقید غرب
قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نی ز رقص دختران بی حجاب

---

[1] ۔ ترکوں نے اہل مغرب کی تقلید کی ہے۔ یہاں ان کی عورتوں کی نیم برہنگی کے انداز کا لباس اور ترکی زبان کے سلسلے میں خط لاطینی کو رسم الخط کے طور پر اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ (مترجم)

فی زسحر ساحرانِ لالہ روست
فی زعریان ساق و فی از قطع موست

محکمی اُو را نہ از لادینی است
فی فروغش از خط لاطینی است

قوّت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانع علم و ہنر عمامہ نیست

علم و فن را ای جوان دشوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوس فرنگ

اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست
ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست

فکر چالاکی اگر داری، بس است
طبع درّاکی اگر داری، بس است

جب شروع شروع میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کا ظہور ہوا، تمام اہل مشرق ان سے خوش تھے اور سب نے ان کے بارے میں ذوق و شوق کا اظہار کیا۔ امید کی جاتی تھی کہ اگر مشرق کی ایک قوم بیدار ہوتی ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے تو شاید دوسری مشرقی اقوام بھی ایسے ہی بیدار ہوں گی۔ علامہ موصوف نے بھی اسی طرح محبت و عقیدت کا اظہار کیا اور کچھ اشعار بھی ان کی مدح میں لکھے۔ لیکن وہ جلد ہی مصطفیٰ کمال اور اتاترکوں سے مایوس ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ یورپ کی تقلید کر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ علم و حکمت اور عقل و

معرفت کو اپنا نصب العین بناتے، وہ رقص، بے دینی، کلاہ فرنگی اور خط لاطینی میں کھو گئے ہیں۔ چنانچہ اسی موقع پر انھوں نے فرمایا :

مغز می باید نہ ملبوس فرنگ

اور اسی موقع کے متعلق فرمایا :

نہال ترک زبرق فرنگ بار آورد
ظہور مصطفوی را بہانہ لولہی است

اور سعید حلیم پاشا کا قول بیان کرتے ہوئے کہا :

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود
گفت "نقش کہنہ را باید زدود"
تو نگردد کعبہ را رخت حیات
گر ز افرنگ آید ش لات و منات
ترک را آہنگ نو در چنگ نیست
تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست
سینۂ او را دمی دیگر نبود
در ضمیرش عالمی دیگر نبود

اور ابدالی شاعر افغانی کے قول کے سلسلے میں کہتے ہیں :

گر کسی شبہا خورد دود چراغ
گیرد از علم و فن و حکمت سراغ
ملک معنی کس حد او را نبست
بی جہاد پیہمی ناید بدست

ترک از خود رفتہ و مست فرنگ

زہر نوشین خوردہ از دست فرنگ

زانکہ تریاقِ عراق از دست داد

من چہ گویم جز "خدایش یار باد"

بندۂ افرنگ از ذوق نمود

می برد از غربیان رقص و سرود

نقد جان خویش در بازد بلہو

علم دشوار است، میسازد بلہو

از تن آسانی بگیرد سہل را

فطرت اُو در پذیرد سہل را

سہل را جستن در ایں دیر کہن

ایں دلیل آنکہ جان رفت از بدن

پھر فرماتے ہیں کہ جس طرح مصطفیٰ کمال پاشا سے غلطی ہوئی، اسی طرح قائد ایران اور اہل ایران بھی غلط راہ پر چل رہے ہیں۔ جاوید نامے میں جہاں ان کی روحانی سیر کا ذکر ہے وہ لکھتے ہیں کہ میں نے نادر شاہ کو دیکھا، وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں:

محرم رازیم باما راز گوی

آنچہ می دانی ز ایران باز گوی

میں نے جواب دیا کہ ایران یورپ کی تقلید کر رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ایرانی اسلام کی عنایات کا حق پہچانتے اور تمدن اسلامی کے فوائد کو سمجھتے، انھوں نے اپنی قدیم تاریخ کو جو فرنگیوں کی کتابوں سے پڑھی ہے سامنے رکھا ہے اور وہ عربوں سے دشمنی کا اظہار کر رہے ہیں۔

بعد مدت چشم خود برخود کشاد
لیکن اندر حلقۂ دامی افتاد

کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ
خالق تہذیب و تقلید فرنگ

کار آن وارفتۂ ملک و نسب
ذکر شاپور است و تحقیر عرب

روزگار اُو تہی از واردات
از قبور کہنہ می جوید حیات

باوطن پیوست واز خود درگذشت
دل بہ رستم داد واز حیدر گذشت

نقشِ باطل می پذیرد از فرنگ
سرگذشت خود بگیرد از فرنگ

حالانکہ اگر عرب نے ایران پر حملہ کیا تو اس میں ایرانیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ حملۂ عرب کے وقت ایران فرسودہ ہو چکا تھا اور اس کے تمام قوانین اور نظام پرانے ہو چکے تھے۔ صحرا سے ایک مرد اُٹھا اور اس نے ایران میں ایک تازہ روح بھر دی۔ اگر یقین نہ آتے تو آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ ایران مسلمان ہوا، اب تک زندہ ہے۔ لیکن رومۃ الکبریٰ (روم مشرقی) جس نے اسلام کو قبول نہ کیا آج صفحۂ ہستی سے یکسر مٹ چکا ہے:

پیریِ ایران زمان یزد جرد
چہرۂ اُو بی فروغ از خون سرد

دین و آئین و نظام او کہن
شید و تار صبح و شام او کہن
موج می در شیشۂ تاکش نبود
یک شرر در تودۂ خاکش نبود
تا ز صحرای رسید شش محشری
آنکہ داد او را حیات دیگری
این چنین حشر از عنایات خداست
پارس باقی، رومۃ الکبریٰ کجاست؟
مرد صحرائی بایران جان دمید
باز سوی ریگ زار خود رمید
کہنہ را از لوح ما بستر دو رفت
برگ و ساز عصر نو آور دو رفت
آہ احسان عرب نشناختند
ز آتش افرنگیان بگداختند

ایسے اہلِ یورپ کا فریب نہیں کھانا چاہیے جو ہماری پستی اور دیگر عیوب کو ہمارے مسلمان ہونے پر محمول کرتے ہیں اور اس بات کے دعوے دار ہیں کہ وہ ہمیں راہِ نجات کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں:

غربیان را شیوہ ہای ساحری است
تکیہ جز بر خویش کردن کافری است
روح را بار گراں آئین غیر
گرچہ آید ز آسمان آئین غیر

ہمیں دوسروں سے مدد نہیں طلب کرنی چاہیے بلکہ اپنا کام خود کرنا چاہیے:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش

براہ دیگران رفتن عذاب است

گر از دست تو کار نادر آید

گناہی ہم اگر باشد ثواب است

اہلِ یورپ کی تمام کوششیں اسی بات پر مرکوز ہیں کہ وہ ہمیں اسیر بنائے رکھیں۔

ہمیں ان سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے:

ترا نادان امید غمگساری ہا ز افرنگ است

دل شاہین نسوزد بہر آن مرغی کہ در چنگ است

پشیمان شو اگر لعلی ز میراث پدر خواہی

کجا عیش برون آوردن لعلی کہ در سنگ است

اہلِ یورپ کے افکار، ان کا نظام و آئین ہمارے درد کا مداوا نہیں:

مثلِ آئینہ مشو محو جمالِ دگران

از دل و دیدہ فرو شوی خیال دگران

یورپ میں ذوق و شوق کی شدت نہیں:

قدح خرد فروزی کہ فرنگ داد مارا

ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر ندارد

ای خوش آن جوی تنک مایہ کہ از ذوق خودی

در دل خاک فرو رفت و بدریا نرسید

از کلیمی سبق آموز کہ دانای فرنگ

جگر بحر شگافید و بسینا نرسید

ہماری اخلاقی تعلیم اور دینی آئین بھی فرنگیوں سے الگ ہے ؛

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسٰی غار و کوہ

اگر انسان شیر کی طرح زندگی بسر کرے تو اس زندگی کی شجاعت اور مردانگی کا ایک لمحہ، بھیڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے ؛

زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دم شیری بہ از صد سال میش

جو شخص زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، اُسے چاہیے کہ وہ تکلیفوں اور خطروں سے روگردانی نہ کرے ؛

غزالی با غزالی درد دل گفت — ازیں پس در حرم گیرم کنامی
بصحرا صید بندان در کمین اند — بکام آہوان صبحی نہ شامی

امان از فتنۂ صیاد خواہم
دلی ز اندیشۂ آزاد خواہم

رفیقش گفت ای یار خردمند — اگر خواہی حیات اندر خطر زی
دمادم خویشتن را بر فسان زن — ز تیغ پاک گوہر تیز تر زی

خطر تاب و توان را امتحان است
عیار ممکنات جسم و جان است

یہاں تک کہ انسان کو اس سے بھی آگے نکل جانا چاہیے اور خطرات کا استقبال کرنا چاہیے۔ اور بے خطر راستوں سے بچ کر چلنا چاہیے ؛

بکیش زندہ دلان زندگی جفاطلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

جو لوگ بے خطر راہوں پر چلتے ہیں وہ پست ہمت ہیں :

وای آن قافلہ کز دونی ہمت میخواست

رہگزاری کہ در و ہیچ خطر پیدا نیست

زندگی کی بنیاد سعی و عمل کے سوا کچھ نہیں :

زندگی جہد است و استحقاق نیست

جز بعلم انفس و آفاق نیست

جو شخص میدان کے ایک گوشے میں کھڑا رہتا ہے اور گرمیِ کارزار کو دور سے دیکھتا ہے وہ لذت زیست سے ناآشنا ہے :

سکندر با خضر خوش نکتہ ای گفت

شریک سوز و ساز بحر و بر شو

تو این جنگ از کنار عرصہ بینی

بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا

نوای زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش در آویز

حیات جاودان اندر ستیز است

پھر فرماتے ہیں کہ ساحل چونکہ حرکت نہیں کرتا اس لیے اپنی ہستی و نیستی اور بود و نبود سے بے خبر رہتا ہے۔ لیکن لہریں حرکت کرتی ہیں اور زندگی کی لذت سے آشنا ہوتی ہیں۔ بھرتری ہری کے دو شعروں کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

این جہانی کہ تو بینی اثر یزدان نیست

چرخہ از تست و ہم آن رشتہ کہ بر دوک تو رشت

پیش آئین مکافات عمل سجدہ گزار

زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

جس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا وہ حسن و جمال سے عاری تھی۔ اس میں جس قدر حسن و زیبائی اور رعنائی پائی جاتی ہے وہ سب انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان گفتگو ہوتی ہے، خدا انسان کو طعنہ دیتا ہے کہ تو نے اس عالم ایجاد میں خلل پیدا کیا اور آلات جنگ و حرب بنائے:

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم   تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

من از خاک پولاد ناب آفریدم   تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہال چمن را

قفس ساختی طائر نغمہ زن را

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی   خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

حسن و قبح کا معیار اور خوبصورتی اور بدصورتی کا انداز جو کچھ بھی مقرر ہے وہ سب کا سب انسان ہی کی چشم ذوق کا نتیجہ ہے۔ یہی ہے جو ایک شے کو حسین اور دوسری کو قبیح کہتا ہے۔ خدا نے اُسے ایک وحشی اور کرخت انسان پیدا کیا تھا جو دوسرے جانوروں سے مختلف نہ تھا بلکہ بعض وجوہ سے ان سے بدتر تھا۔ اپنی ذاتی ہمت کی بنا پر جو کچھ تھا اس سے بہتر ہوگیا۔ انسان اتنا کم مایہ نہیں بلکہ برعکس اس کے اس میں ایسی صفات اور خصوصیات ہیں جو نہایت قابل قدر ہیں۔ جس روز ایک مٹھی بھر خاک اور چند پانی کے قطروں سے گلِ آدم کو تیار کیا گیا، گفتگو کا دروازہ کھلا اور راز وجود کو

فاش کیا گیا :

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد

این مشت غباری را انجم بسجود آمد

آن راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود

از شوخیٔ آب و گل در گفت و شنود آمد

جبرئیل بھی اپنی عظمتوں کے باوجود انسان کی خاک پا کو نہیں پہنچ سکتے :

با دج مشت غباری کجا رسد جبریل

بلند نامیٔ او از بلندیٔ بام است

تو از شمار نفس زندہ ای، نمیدانی

کہ زندگی بشکست طلسم ایام است

دراصل جس کو عالم وجود کہتے ہیں، فقط انسانی تخیل ہی کا کرشمہ ہے۔ ہم جو دیکھتے ہیں وہ ہے اور جو ہمیں نظر نہیں آتا وہ نہیں ہے۔ اس اعتبار سے ہم کائنات کو پروردگار کی خلاقیت کا نشان کیسے کہہ سکتے ہیں :

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من

چہ زمان و چہ مکاں، شوخیٔ افکار من است

آن جہانی کہ درو کاشتہ را می درووند

نور و نارش ہمہ از سبحہ و زنار من است

ساز تقدیرم و صد نغمۂ پنہان دارم

ہر کجا زخمۂ اندیشہ رسد، تار من است

ای من از فیض تو پایندہ، نشان تو کجاست

این دو گیتی اثر ماست، جہان تو کجاست

یہاں تک کہ جس شے کو انسان کی کمزوری پر محمول کیا جاتا ہے وہی اس کی شان امتیاز ہے۔ درد و بیتابی، اشک رواں، غم روزگار، سب کے سب انسان کی سربلندی کا سرمایہ ہیں۔ زبور عجم میں خدا کو مخاطب کر کے پوچھتے ہیں۔ کیا ان چیزوں میں سے تیرے پاس کچھ ہے؟:

بجہان دردمندان تو بگو چہ کار داری؟

تب و تاب ما شناسی؟ دل بیقرار داری؟

چہ خبر ترا ز اشکی کہ فرو چکد ز چشمی

تو ببرگ گل ز شبنم در شاہوار داری؟

چہ بگویمت ز جانی کہ نفس نفس شمارد

دم مستعار داری؟ غم روزگار داری؟

اس سے بھی بالاتر انسان کا دل ہے۔ اگر حافظ شیرازی عشق کو حسن پروردگار کی جلوہ گری کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور انسان کو اس عشق کی امانت گاہ تصور کرتے ہیں تو اقبال آدمی کو تگ و پوی عشق کا حاصل قرار دیتے ہیں اور اس مشت خاکی کو جس کے سینے میں دل ہے، ساری کائنات سے گراں تر سمجھتے ہیں:

عشق اندر جستجو افتاد و آدم حاصل است

جلوۂ او آشکار از پردۂ آب و گل است

آفتاب و ماہ و انجم میتوان دادن ز دست

در بہای آن کف خاکی کہ دارای دل است

لیکن دل فقط گوشت، چربی، رگ و خون ہی نہیں جو ہمارے سینے کے صندوق میں بند ہے، بلکہ دل وہ دل ہے کہ درد سے آشنا ہو:

تنی پیدا کن از مشت غباری
تنی محکم تر از سنگین حصاری

درون او دل درد آشنای
چو جوی در کنارِ کوهساری

دل وہ ہے جو سوز آرزو اور آتش تمنا سے پیچ و تاب میں ہو ؛

زدست ساقی خاور دو جام ارغوان درکش
کہ از خاک تو خیزد نالۂ مستانہ پی در پی
دلی کو از تب و تاب تمنا آشنا گردد
زند بر شعلۂ خود صورت پروانہ پی در پی

تمنا اور آرزو دل کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ انسان کی موت اُس وقت واقع ہوتی ہے جب وہ کوئی نئی آرزو پیدا نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ قدما کا قول ہے، پانی کی تلاش نہیں کرنی چاہیے بلکہ تشنگی پیدا کرنی چاہیے، طبیب کی نہیں بلکہ درد کی جستجو ضروری ہے۔ علامہ فرماتے ہیں : اگر آرزو اور تمنا میں شدت ہے تو مقصد ضرور حاصل ہو گا۔ عقل بھی جو ساری کون و مکان کا ایک لمحہ میں جائزہ لے لیتی ہے، آرزو ہی کی مخلوق ہے ؛

دل ز سوز آرزو گیرد حیات — غیر حق میرد چو او گیرد حیات
چوں ز تخلیق تمنا باز ماند — شہپرش بشکست واز پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرای خودی — موج بیتابی ز دریای خودی
آرزو صید مقاصد را کمند — دفتر افعال را شیرازہ بند
زندہ را نفی تمنا مردہ کرد — شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد

عقل ندرت کوش و گردون تاز چیست؟
ہیچ می دانی کہ ایں اعجاز چیست؟
زندگی سرمایہ دار از آرزوست
عقل از زائندگانِ بطن اُوست

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر اقبال کے افکار و اشعار کے اہم ترین پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں، اور ہم اس کے بنیادی فلسفے سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ تمام نکات جو ہم نے اب تک ان سے مستنبط کیے، بطور تمہید کے تھے۔ فلسفۂ اقبال کو فلسفۂ خودی یا فلسفۂ سخت کوشی کہا جاتا ہے۔ خودی سب کچھ ہے۔ یہ وہی شے ہے جسے بعض لوگ شخصیت کہتے ہیں۔ خودی وہی ہے جسے ناصر خسرو مکرراً لفظ خویشتن سے تعبیر کرتے ہیں مثلاً اس شعر میں:

خویشتن خویش را روندہ گمان بر
ہیچ نشستہ نہ نیز خفتہ مبر ظن

خودی وجود انسان میں تمام موروثی رجحانات اور اکتسابی تجربات زندگی کی تاثیرات کی وحدت کا نام ہے۔ خودی اس سوال کا جواب ہے جو قدما پوچھا کرتے تھے کہ جب کوئی کہتا ہے "میں"، تو کیا مقصد ہوتا ہے؟ روح یا جسم؟ یا دونوں؟ خودی وہی ہے جسے یورپین زبانوں میں ۔ ایغو ۔ کہتے ہیں جس کا پہچاننا ہر انسان کا فرض ہے:

وجود کوہسار و دشت و در، ہیچ — جہاں فانی، خودی باقی، دگر، ہیچ
دگر از شنکر[1] و منصور کم گوی — خدا را ہم براہ خویشتن جوی
بخود گم بہر تحقیق خودی شو — انا الحق گوی و صدیق خودی شو

---

[1] ۔ شنکر آٹھویں صدی عیسوی مطابق دوسری صدی ہجری میں گزرا ہے۔ فلسفۂ ہندی کا مشہور عالم تھا۔ منصور سے مراد حسین منصور حلاج ہے۔

خودی سرچشمۂ جہاں ہے اور شخصی اور انفرادی زندگی کا انحصار استحکام خودی پر ہے اور خودی کی زندگی آرزو سے ہے ؛

از خودی طرح جہانی ریختند
دلبری با قاہری آمیختند

ہر کجا پیدا و ناپیدا خودی
بر نمی تابد نگاہ ما خودی

نار ہا پوشیدہ اندر نور اوست
جلوہ ہای کائنات از طور اوست

ہر زمان ، ہر دل درین دیر کہن
از خودی در پردہ میگوید سخن

ہر کہ از نارش نصیب خود نبرد
در جہان خویشتن بیگانہ مرد

زندگی شرح اشارات خودی است
لا و الّا از مقامات خودی است

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گرد خود گردندہ چون پرکار باش

منکر حق نزد ملّا کافر است
منکر خود نزد من کافر تر است

زندگی جز لذت پرواز نیست
آشیان با فطرتِ او ساز نیست

رزق زاغ و کرگس اندر خاک گور
رزق بازان در سواد ماہ و ہور

انسان کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ معرفتِ نفس، ملکِ نفس اور تسلطِ نفس کے طریق پر نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ خدا کو بھی نورِ خودی ہی سے دیکھنا چاہیے:

مشو نومید ازین مشت غباری
پریشان جلوۂ ناپایداری
چو فطرت میترا شد پیکری را
تماشا میکند در روزگاری

جہان رنگ و بوی فہمیدنی ہست
درین وادی بسی گل چیدنی ہست
ولی چشم از درون خود نبندی
کہ در جان تو چیزی دیدنی ہست

زمن گو صوفیان باصفا را
خدا جویان معنی آشنا را
غلام ہمت آن خود پرستم
کہ با نور خودی بیند خدا را

خدا بندے سے کہتا ہے کہ اگر تو مجھے پہچاننا چاہتا ہے اور رازِ عالم سے آگاہی چاہتا ہے تو اپنے آپ کو دیکھ اور کائنات کو اپنے میں جذب کر لے:

زندگی خواہی خودی را پیش کن — چار سو را غرق اندر خویش کن
باز بینی من کیم تو کیستی — در جہاں چوں مردی و چون زیستی

زرتشت اہرمن کے جواب میں کہتا ہے کہ زندگی نفس کو وسعت دینے اور تکمیل نفس میں سختی برداشت کرنے کا نام ہے۔ انسان بحر نور کی لہروں میں سے ایک لہر ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ سمندر کے ساحل پر جو عین ظلمت ہے، حملہ آور ہو اور اہرمن کو قتل کرے اور اس کے خون سے پوشیدہ حقائق کو لکھے:

نور دریای است، ظلمت ساحلش
ہمچو من سیلی نزاد اندر دلش
اندرونم موج ھای بے قرار
سیل را جز غارت ساحل چہ کار
نقش بیرنگی کہ او را کس ندید
جز بخون اہرمن نتوان کشید
خویشتن را وانمودن زندگی است
ضرب خود را آزمودن زندگیست
از بلاہا پختہ تر گردد خودی
تا خدا را پردہ در گردد خودی

"اسرار خودی" جو علامہ مرحوم کی پہلی فلسفیانہ منظوم کتاب ہے، تمام کی تمام خودی ہی کے موضوع پر ہے اور اس میں انسان کو خودی کی پرورش کی تلقین کی ہے۔ اس میں پہلا موضوع[۱] یہ ہے "اصل نظام عالم از خودی است و تسلسل حیات و تعینات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد۔" اس موضوع کے اشعار کا خلاصہ یہ ہے:

پیکر ہستی ز آثار خودی است ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
صد جہان پوشیدہ اندر ذات او غیر او پیداست از اثبات او

---

۱ ۔ نظام

وسعت ایام جولانگاہ او　　آسمان موجی ز گرد راہ او
وا نمودن خویش را خوی خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروی خودی است

چون حیات عالم از زور خودی است　　پس بقدر استواری زندگیست
قطرہ چون صرف خودی از بر کند　　ہستی بی مایہ را گوہر کند
سبزہ چون تاب دمید از خویش یافت　　ہمت او سینۂ گلشن شگافت
چون زمین بر ہستیٔ خود محکم است　　ماہ پابند طواف پیہم است
ہستیٔ مہر از زمین محکم تر است　　پس زمین مسحور چشم خاور است
چوں خودی آرد بہم نیروی زیست
می کشاید قلزمی از جوی زیست

اس کتاب کی دوسری فصل کا موضوع یہ ہے کہ " حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد است " یعنی اگر آدمی کی خودی ہمیشہ کسی تازہ مقصد و مراد کو اپنے لیے وضع نہ کرتی رہے تو اس کا تعین اور اس کی انفرادیت زائل ہو جاتی ہے ۔ بلکہ یہ عشق و آرزو ہی ہے کہ جو انسان کی تخلیق اور اس کے قوای باطنی اور حواس ظاہری کی پیدائش کا باعث ہوا :

زندگانی را بقا از مدعاست　　کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار　　تا نگردد مشت خاک تو مزار
آرزوی کو بزورِ خود شکست　　سر ز دل بیرون زد و صورت ببست
دست و دندان و دماغ و چشم و گوش　　فکر و تخییل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو در جنگاہ تاخت　　بہر حفظ خویش این آلات ساخت

آگہی از علم و فن مقصود نیست　　غنچہ و گل از چمن مقصود نیست
علم از سامان حفظ زندگیست　　علم از اسباب تقویم خودی است
علم و فن از پیشخیزان حیات　　علم و فن از خانہ زادان حیات

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

اس موضوع پر جاوید نامے میں فرماتے ہیں :

زندگی ہم فانی و باقی است
این ہمہ خلاقی و مشتاقی است
زندہ ای ؟ مشتاق شو، خلّاق شو
ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو
در شکن آن را کہ ناید سازگار
از ضمیر خود دگر عالم بیار

تیسری فصل کا موضوع ہے " خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد " اس میں سے یہ اشعار نہایت عمدہ ہیں :

نقطۂ نوری کہ نام او خودیست　　زیر خاک ما شرار زندگیست
از محبت میشود پاینده تر　　زنده تر، سوزنده تر، تابنده تر
از محبت اشتعال جوهرش　　ارتقائی ممکنات مضمرش
فطرت او آتش اندوزد ز عشق　　عالم افروزی بیاموزد ز عشق
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست　　اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
عاشقی آموز و محبوبی طلب　　چشم نوحی، قلب ایوبی، طلب
کیمیا پیدا کن از مشت گلی　　بوسہ زن بر آستان کاملی

شمع خود را ہمچو رومی برفروز　　روم را در آتش تبریز سوز
ماکہ از قید وطن بیگانہ ایم　　چون نگہ نور دو چشیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما　　شبنم یک صبح خندانیم ما
مست چشم ساقی بطحا ستیم
در جہان مثل می و مینا ستیم

چوتھی فصل کا موضوع یہ ہے کہ سوال کرنے سے خودی کمزور پڑ جاتی ہے۔ انسان کتنا ہی تنگدست اور مفلوک الحال کیوں نہ ہو، اُسے دوسروں کے احسان کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہیے:

ای خنک آن تشنہ کاندر آفتاب
می نخواہد از خضر یک جام آب

پانچویں فصل میں وہ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ جب عشق و محبت سے خودی مستحکم ہوتی ہے تو کائنات کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے:

از محبت چون خودی محکم شود
قوتش فرماں دہِ عالم شود

چھٹی فصل میں وہ اس مضمون کی ایک حکایت درج کرتے ہیں کہ نفی خودی (یعنی فنای نفس، نفسانی لذات کو ترک کرنا، حقیر اور مختصر زندگانی پر قناعت کرنا، فقیری و درویشی کی خو ڈالنا) محکوم قوموں کا شیوہ ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان طریقوں سے اقوام غالب کے اخلاق و فطرت کو کمزور کر دیں۔ فرماتے ہیں کہ چند بھیڑیں ایک چراگاہ میں رہتی تھیں، اور چونکہ نعمتوں کی فراوانی تھی اس لیے انھیں زندگی میں کسی تکلیف سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کچھ شیر جنگل سے باہر نکلے اور ان پر غالب آ گئے اور ان کی آزادی سلب کر لی۔ اس طرح سالہا سال گزر گئے، یہاں تک کہ:

گوسفندی زیرکی فہمیدہ ای
کہنہ سالی گرگ باران دیدہ ای

اس بھیڑ نے اپنی قوم کے تحفظ اور شیروں سے انتقام لینے کے لیے ایک تدبیر سوچی۔ دل میں کہنے لگی کہ بھیڑوں کو سمجھا بجھا کر شیر تو نہیں بنایا جا سکتا، البتہ شیر نر کو بھیڑ بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میں ایک نئی شریعت لے کر آئی ہوں۔ سنو سب کے سب گھاس کھاؤ اور حیوانی گوشت کھانا چھوڑ دو۔ خدا تعالیٰ نے بہشت برین کمزوروں کے لیے بنائی ہے، وہ طاقتوروں کو دوزخ میں بھیجے گا:

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی است — زندگی مستحکم از نفی خودی است
روح نیکان از علف باید غذا — تارک اللحم است مقبول خدا
ذرہ شو، صحرا مشو، گر عاقلی — تا ز نور آفتابی برخوری
ای کہ می نازی بذبح گوسفند — ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند
زندگی را میکند نا پایدار — جبر و قہر و انتقام و اقتدار
سبزہ پامال است و روید بارہا — خواب مرگ از دیدہ شوید بارہا
غافل از خود شو اگر فرزانہ ای — گر ز خود غافل نہ ای، دیوانہ ای
چشم بند و گوش بند و لب ببند — تا رسد فکر تو بر چرخ بلند

ایں علف زار جہان ہیچ است ہیچ
تو برین موہوم، ای نادان مپیچ

جب نبوت کا دعویٰ کرنے والی بھیڑ نے یہ باتیں کہیں تو شیروں نے جو کام کی سختی اور محنت سے تھکے ماندے ہو رہے تھے اور اُن کی طبیعت تن آسانی اور تن پروری کی طرف مائل تھی، اس کے دین کو پسند کیا اور کام چھوڑ دیا اور رفتہ رفتہ

بے ہمتی اور پستی میں کھو گئے۔ شیروں کی خصلت بھیڑوں کی طبیعت میں بدل گئی:

شیر بیدار از فسون میش خفت

انحطاط خویش را تہذیب گفت

پھر ساتویں فصل میں لکھتے ہیں کہ افلاطون یونانی جس کے افکار سے اقوام اسلامیہ کے تصوف اور ادبیات پر گہرا اثر پڑا ہے، بھیڑوں ہی کے مسلک پر چلتا رہا ہے۔ اس کے خیالات سے بچنا چاہیے:

راہب دیرینہ افلاطون حکیم — از گروہ گوسفندان قدیم

رخش او در ظلمت معقول گم — در کہستان وجود افگندہ سُم

آنچناں افسون نامحسوس خورد — اعتبار از دست و چشم و گوش برد

گفت، سر زندگی در مردنست — شمع را صد جلوہ از افسردنست

عقل خود را بر سر گردون رساند — عالم اسباب را افسانہ خواند

فکر افلاطون زیان را سُود گفت — حکمت او بود را نابود گفت

فطرتش خوابید و خوابی آفرید — چشم ہوش او سرابی آفرید

بس کہ از ذوق عمل محروم بود — جان او وارفتہ معدوم بود

منکر ہنگامہ موجود گشت

خالق اعیان نامشہود گشت

لیکن اقبال ان باتوں کا یوں جواب دیتے ہیں:

زندہ جان را عالم امکان خوشست

مردہ دل را عالم اعیان خوش است

راہب ما چارہ غیر از رم نداشت

طاقت غوغای این عالم نداشت

قوتِ‌ِاو از سکر او مسموم گشت

خفت و از ذوق عمل محروم گشت

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

حربۂ دون ہمتان کین است و بس　　زندگی را این یک آئین است و بس

زندگانی قوتِ پیداستی　　اصل او از ذوق استیلاستی

عفو بیجا سردیٔ خون حیات　　سکتہ‌ای در بیت موزون حیات

ہر کہ در قعر مذلت ماندہ است

ناتوانی را قناعت خواندہ است

میرے خیال میں یہاں عقیدۂ افلاطون اور اس پر علامہ اقبال کے اعتراضات کی مختصر سی توضیح کر دینی ضروری ہے۔ جو لوگ فلسفیانہ اصطلاحوں اور افلاطون کے عقیدوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ افلاطون کا عقیدہ یہ تھا کہ جو کچھ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں وہ ایسے ظواہر ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن محسوسات کی خارجی دنیا میں ایسے حقائق اور معانی پوشیدہ ہیں جو اس تغیر سے محفوظ ہیں۔ افلاطون ان غیر متغیر کو لفظ "اعیان ثابتہ" یا "مثل" سے پکارتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ عقل محض کے ذریعے ان غیر متغیر حقائق کی معرفت ممکن ہے اور ہمارے ظاہری حواس کا اس معرفت سے کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ یہ حواس ان ظواہر متغیر سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ہماری آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ ایسے سائے کی طرح ہیں جو متحرک اجسام کی حرکت سے کسی دیوار پر پڑتا ہے۔ ہمیں ان اجسام سے واقفیت نہیں ہوتی، لیکن اسی سائے کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں، اس لیے لازمی ہے کہ ہم ان محسوسات سے قطع نظر کر کے محض استدلال و استنباط سے ان حقائق کو معلوم کریں۔

اس بات کو سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ افلاطون کا خیال ہے کہ جو کچھ ہم حواس کے ذریعے دیکھتے ہیں وہ سوائے وہم و گمان کے کچھ نہیں۔ علامہ کہتے ہیں کہ یہ خیال محض خواب کی باتیں ہیں۔ افلاطون عالم موجودات کا منکر ہے اور عالم خواب و خیال میں موہومات کی تخلیق کرتا ہے:

از نشیمن سوی گردون پر کشود
باز سوی آشیان نامد فرود
در خم گردون خیال او گمست
من ندانم دُر دیا خشت خم است

افلاطون کے افکار کا جو اثر تصوف اسلامی پر پڑا ہے، پروفیسر نکلسن مرحوم نے ترجمۂ اسرار خودی میں اس کی توضیح کی ہے، جسے نقل کرنا یہاں مناسب ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ:

"مذہب افلاطون کا مستقل اثر مسلمانوں کے افکار پر کچھ زیادہ نہیں پڑا۔ مسلمانوں نے شروع میں جب یونانی فلسفے کو اخذ کرنا شروع کیا تو انھوں نے ارسطو کی طرف توجہ دی۔ اس میں بھی انھیں ارسطو کی اصل تصنیفات ہاتھ نہ لگ سکیں، بلکہ انھوں نے صرف ان کتابوں کے ترجمے پڑھے جو ارسطو کے نام سے منسوب تھیں۔ دراصل یہ کتابیں جدید افلاطونی حکماء کی تصنیف تھیں۔ مسلمانوں نے جن عقائد کو ارسطو کے عقائد سمجھ لیا وہ دراصل فلوطینس[1]، پروقلس[2] اور اسکندریہ کے حکماء متاخرین کا

---

[1] Plotinus -

[2] Proclus -

فلسفہ تھا، جو جدید افلاطونی فلسفہ کے معتقد تھے۔ اس بنا پر
کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے ذہنی اور روحانی انقلاب و
ارتقا پر افلاطون کا بلا واسطہ بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ ہم
اُسے اسلامی تصوف کا سرچشمہ کیوں نہ کہیں، نہ سہی، تاہم
مسلمانوں کے متصوفانہ افکار کا دارومدار اسی فلسفے پر ہے۔"

علامہ اقبال نے خود بھی اپنے ایک خط میں جو انھوں نے نکلسن مرحوم کے نام لکھا تھا، اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ خط "اسرارِ خودی" کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں درج ہے۔ علامہ موصوف کہتے ہیں:

"افلاطون سے میرا اختلاف اُن فلسفیانہ نظریات کی وجہ سے
ہے جو حیات کی بجائے ممات کو انسان کا انتہائی مقصد سمجھے
ہوئے ہیں اور ہیولیٰ اور مادہ سے جو زندگی کی سب سے
بڑی رکاوٹ ہیں، غافل ہیں۔ اور اس مادے[1] کو فنا کرنے
کی جگہ ہمیں اس سے بھاگنے کی ترغیب دیتے ہیں۔"

زبورِ عجم میں یہ قطعہ اسی موضوع پر ہے:

دانش مغربیان فلسفۂ مشرقیان
ہمہ بتخانہ و در طوف بتان چیزی نیست
از خود اندیش و ازین بادیہ ترستان مگذر
کہ تو ہستی و وجودِ دو جہان چیزی نیست

---

[1] - یہی تعلیم جو علامہ اقبال ان فلسفیوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، اپنی ماہیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اوریگنس، فلوطینس، فرحوزیوس اور اسکندریہ کے دوسرے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اسرار خودی کی آٹھویں فصل کا عنوان "درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ" ہے۔ اس سلسلے میں علامہ فرماتے ہیں کہ انسانی زندگی کی بنا آرزو اور تمنا پر ہے اور زندگی سے مراد تسخیر ہے اور تمنا اس افسون کی مانند ہے جو اس تسخیر کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ یہ تمنا کہاں سے آتی ہے؟ دنیا کی حسین و جمیل اشیاء انسانی دل پر نقش ہو جاتی ہیں اور یہیں سے آرزو کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسن و جمال ہی خالق آرزو ہے۔ پھر علامہ فرماتے ہیں کہ شاعر کا دل حسن و جمال کی جلوہ گاہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ فطرت کے حسن میں اضافہ بھی کر سکتا ہے اور حسین شے کو حسین تر شکل میں دیکھ سکتا ہے:

سینۂ شاعر تجلی زار حُسن

خیزد از سینای او انوار حسن

(بقیہ: حاشیہ صفحہ گزشتہ)

تمام یونانی فلسفی جو عیسائی تھے اور جنھوں نے فلسفہ دین مسیحی کی بنیاد رکھی تھی، مادے سے منحرف تھے نہ کہ افلاطون۔ ان فلسفیوں نے افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کی تشریح کی تھی اور اُن کے عقاید کی اپنے ذہنی رجحانات کے مطابق تاویل بھی کی تھی اور پھر یہی شرحیں عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں۔ تصوف اسلامی کے نشو و ارتقا میں ان کا بہت گہرا اثر موجود ہے۔ مسلمان ایسے عقاید کو افلاطون اور ارسطو کا نام لے کر بیان کرتے ہیں اور اسی طرح علامہ اقبال بھی افلاطون پر تنقید کرتے ہیں۔

(مترجم) یہ درست ہے لیکن افلاطون کی اپنی تصانیف بھی قطعی طور پر ایسے ہی عقاید کی حامل ہیں جیسا کہ خود مصنف کے دوسرے بیانات سے ظاہر ہے۔

از نگاہش خوب گردد خوب تر
فطرت از افسون او محبوب تر
بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش
صد جہان تازہ مضمر در دلش
در دماغش، نادمیدہ لالہ ہا
ناشنیدہ نغمہ ہا، ہم نالہ ہا
کاروان ہا اندر الیش گام زن
در پیٔ آواز نالیش گام زن

اس قوم پر افسوس ہے جو جسمانی اور روحانی تنزل میں مبتلا ہو جاتی ہے اور موت و ہلاکت کی راہ اختیار کرتی ہے۔ ایسی ہی قوم کے شاعر زندگی سے روگردانی کرتے ہیں۔ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جاتے ہیں اور دنیا کو حقیر اور پست سمجھتے ہیں:

وای قومی کز اجل گیرد برات
شاعرش وابوسدؔ از ذوق حیات
خوش نماید زشت را آیینہ اش
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش
بوسۂ او تازگی از گل برد
ذوق پرواز از دل بلبل برد
سست اعصاب تو از افیون او
زندگانی قیمت مضمون او

لہ ۔ وابوسد کے معنی روگردانی کرنا ہے جو بوسیدن کی ضد ہے، جس کے معنی امیدوار ہونے کے ہیں۔

می رباید ذوق رعنائی ز سرو
جرّہ شاہین از دم سردش تذرو

ماہی و، از سینہ تا سرآدم است
چون بنات آشیان[1] اندیم است

از نوا بر ناخدا افسون زند
کشتیش در قعر دریا افگند

نغمہ ہایش از دلت دزدد ثبات
مرگ را از سحر اُو دانی حیات

یہی فصل تھی جہاں اسرارخودی کے پہلے ایڈیشن میں انھوں نے صوفی شعراء پر نکتہ چینی کی تھی، اور حافظ پر سخت حملے کیے تھے، جو اہل ہندوستان کو ناگوار گزرے اور انھوں نے علامہ پر اس سختی سے اعتراضات کیے کہ وہ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ان اشعار کو حذف کرنے پر مجبور ہو گئے اور صرف اسی پر اکتفا کیا کہ لوگوں کو اس قسم کے شعراء سے متنبہ کریں اور کہیں کہ ایسے شعراء کی پیروی نہ کریں۔

---

[1] ۔ بنات آشیاں سے مراد وہ دختران دریائی ہیں جن کا ذکر قدیم یونانی داستانوں میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جزیرے میں مقیم تھیں۔ اُن کے جسم کا آدھا حصہ مچھلی کا سا تھا اور ان کی آواز سخت جاذب ہوتی تھی۔ جو شخص سنتا تھا، شیفتہ ہو جاتا تھا اور بے ساختہ ادھر کھنچ جاتا تھا۔ کشتی بان اپنی کشتی کا رُخ اُن کی طرف پھیر دیتے اور آخر ان کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیتے تھے۔ یورپ میں انھیں Sirens کہا جاتا ہے۔ لفظ آشیان سے مراد اوقیانوس ہے۔ اردو میں انگریزی لفظ Ocean سے بنا ہے۔

ای زپا افتادہ صہبای او
صبح تو از مشرق مینای او
آنچناں زار از تن آسانی شدی
در جہان ننگ مسلمانی شدی
عشق رسوا گشتہ از فریاد تو
زشت اُو تمثالش از بہزاد تو
وای بر عشقی کہ نار او فسرد
در حرم زائید و در بتخانہ مرد

پھر علامہ شاعر سے خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اگر تجھے فکر روشن حاصل ہے تو عمل کی طرف قدم بڑھا اور ان مشرقی صوفیانہ افکار کو چھوڑ دے جن کا تو عادی ہو چکا ہے، اور اس جوش و خروش اور سعی و عمل کی طرف چل جو ابتدائے اسلام میں صحرائی عربوں کا شیوہ تھا اور جس کے بل پر انھوں نے دنیا کو مسخر کر لیا تھا:

ای میان کیسہ ات نقد سخن
بر عیار زندگی او را بزن
فکر روشن بین عمل را رہبر است
چو درخش برق پیش از تندر است
فکر صالح در ادب میبایدت
رجعتی سوی ادب میبایدت
از چمن زار عجم گل چیدہ ای
نو بہار ہند و ایران دیدہ ای

اندکی از گرمی صحرا بخور
بادۂ دیرینہ از خرما بخور
تا شوی در خورد پیکار حیات
جسم و جانت سوزد از نار حیات

اسرار خودی کی نویں فصل "تربیتِ خودی" پر ہے۔ علامہ موصوف تربیتِ خودی میں تین مرحلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے، دوسرا ضبطِ نفس کا، اور تیسرا خلیفۃ اللہ ہونے اور نیابتِ الٰہی کا۔ اس سے پہلے وہ نصیحت کر چکے ہیں، کہ عرب کی طرف لوٹ جاؤ اور صحرا کی گرمی کھاؤ۔ اس جگہ وہ اونٹ کی زندگی سے تشبیہیں اور استعارے لیتے ہیں جو ریگستان و بیابان میں خار دار جھاڑیاں کھاتا اور سختیاں سہتا ہے اور اپنے صبر و تحمل سے استقلالِ نفس کا مالک بن جاتا ہے۔ صحرا میں دوسرے جانوروں سے بڑھ کر اس میں زندگی کے زیادہ مناسبات پاتے جاتے ہیں:

در اطاعت کوش ای غفلت شعار
میشود از جبر پیدا اختیار
ناکس از فرمان پذیری کس شود
آتش از باشد ز طغیان خس شود
ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند
خویش را زنجیریٔ آئین کند
بادرا زندان گل خوشبو کند
قید بو را نافۂ آہو کند
میزند اختر سوی منزل قدم
پیش آئینی سر تسلیم خم

لالہ پی ہم سوختن قانون او
برجہد اندر رگ او خون او
قطرہ ہا دریاست از آیین وصل
ذرہ ہا صحراست از آیین وصل
باطن ہر شی ز آیینی قوی
تو چرا غافل ازین سامان روی
باز ای آزاد دستور قدیم
زینت پا کن ہمان زنجیر سیم
شکوہ سنج سختی آیین مشو
از حدود مصطفیٰ بیرون مرو

خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں احکام الٰہی اور قانون محمدی کی اطاعت کرنی چاہیے تاکہ اس جبر اور پابندی کی راہ سے ہم حریت کی طرف جائیں اور صاحب اختیار ہو جائیں۔

پھر وہ کہتے ہیں کہ زمام نفس کو تھامے کیوں کہ اگر تیرا اپنا فرمان تجھ پہ جاری نہیں تو دوسرے تجھ پہ حکم چلائیں گے:

ہر کہ بر خود نیست فرمانش روان
میشود فرمان پذیر از دیگران
طرح تعمیر نو از گل ریختند
با محبت خوف را آمیختند
خوف دنیا، خوف عقبیٰ، خوف جان
خوف آلام زمین و آسمان

حب مال و دولت و حب وطن
حب خویش و اقربا و حب زن

تا عصای لا الٰہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست

ہر کہ حق باشد چو جان اندر تنش
خم نگردد پیش باطل گردنش

خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد

میکند از ماسوا قطع نظر
می نہد ساطور بر حلق پسر

با یکی مثل ہجوم لشکر است
جاں بچشم او زباد ارزان تر است

ایں ہمہ اسباب استحکام تست
پختہ ای محکم اگر اسلام تست

اس جگہ پہنچ کر انسان تیسرے مرحلے میں داخل ہوتا ہے جو نیابت الٰہی کا مرحلہ ہے اور سایۂ خدا بن جاتا ہے:

نائب حق در میان بودن خوش است — بر عناصر حکمران بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است — ہستی او ظل اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگہ بود — در جہان قائم بامر اللہ بود

خیمه چو در وسعت عالم زند | این بساط کهنه را برهم زند
فطرتش معمور و می خواهد نمود | عالم دیگر بیارد در وجود
صد جهان مثل جهان جزو و کل | روید از کشت خیال او چو گل
پخته سازد فطرت هر خام را | از حرم بیرون کند اصنام را
نغمه زا تار وی از مضراب او | بهر حق بیداری او، خواب او
شیب را آموزد آهنگ شباب | می دهد هر چیز را رنگ شباب
نوع انسان را بشیر و هم نذیر | هم سپاهی، هم سپه گر، هم امیر
چون عنان گیرد بدست آن شهسوار | تیز تر گردد سمندر روزگار
خشک سازد هیبت او نیل را | میبرد از مصر اسرائیل را
از قم او خیزد اندر گور تن | مرده جانها چون صنوبر در چمن
زندگی را می دهد تغییر نو | می دهد این خواب را تعبیر نو

هستی مکنون او راز حیات
نغمه نشنیده ساز حیات

ایسا ہی انسان نوع بشر کا قائد اور پیشوا ہوتا ہے۔ انسانوں کو چاہیے کہ اس کے پیچھے چلیں اور بے چون وچرا اس کے پیش کیے ہوئے دستوروں پر عمل پیرا ہوں:

ای سوار اشهب دوران بیا | ای فروغ دیدهٔ امکان بیا
رونق هنگامهٔ ایجاد شو | در سواد دیده ها آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن | نغمهٔ خود را بهشت گوش کن
خیز و قانون اخوت ساز ده | جام صهبای محبت باز ده
ریخت از جور خزان برگ شجر | چون بهاران بر بهار ما گزر

سجدہ ہای طفلک و برنا و پیر از جبین شرمسار ما بگیر
از وجود تو سرافرازیم ما
پس بسوزاین جہان سازیم ما

یہاں ضمناً ایک چیز کی وضاحت کر دینی چاہیے۔ جو لوگ الہیات اور فلسفۂ اسلامی سے واقف ہیں، جانتے ہیں کہ یہ خیال اور فلسفۂ علامہ اقبال کوئی نئی چیز نہیں۔ الہیات کے ماہر قدیم زمانے سے ہی اس بات کے معتقد تھے کہ نفس عاملہ عالی ترین اور شریف ترین شے ہے جو اس کائنات میں موجود ہے۔ اس نفس عاملہ کی نشو و نما ضروری ہے تاکہ بتدریج اوج کمال کو پہنچ جائے۔ حکماء کہتے تھے کہ خلقت کے مختلف ارکان (جمادات، نباتات اور حیوانات سب کے سب) ہمیشہ ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتے رہتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اطاعت کی راہ سے ترقی کے زینے پر چڑھتے جاتا ہے یہاں تک کہ اپنے مقام پہ پہنچ جاتے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ارکان مختلف ارکان نہیں بلکہ ایک ہی وجود کی مختلف حالتیں ہیں۔ ان حالتوں میں سب سے کرخت اور کثیف حالت جمادی کی ہے۔ ضروری ہے کہ وجود سے حالت لطیف ہو تاکہ وجود اس لطیف تر حالت کی طرف چل سکے۔ یہ لطیف تر حالت حالت نباتی ہے۔ نباتات، جمادات سے اطاعت و بندگی کی طالب ہوتی ہیں۔ جو جمادات، نباتات کی مطیع ہو جاتی ہیں، اطاعت کا صلہ پاتی ہیں اور وہ صلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نباتات کے درجے پر پہنچ جاتی ہیں اور اُن میں شکل، بُو اور لذت آجاتی ہے اور پھر اُن میں نشو و نما پانے، اور پھلنے پھولنے کی قوت آجاتی ہے۔ اسی طرح ایک دوسری حالت اور دوسرا درجہ بھی ہوتا ہے جو حیوانات کا ہے۔ حیوان بھی نباتات سے طاعت و اطاعت کا طالب ہوتا ہے۔

اور جو نبات حیوان کی اطاعت کرتی ہے وہ اپنی بندگی اور اطاعت کا صلہ پاتی ہے اور حیوانات کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ جب تک وہ نباتات کے مرحلے پر رہتی ہے اس میں نمو کی حرکت ہوتی ہے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہو سکتی اور اس میں ارادہ بھی نہیں ہوتا۔ جونہی کہ نبات، حیوان میں بدلتی ہے۔ حرکت انتقال اور حرکت ارادی کی حامل بن جاتی ہے۔ جو نبات ترقی نہیں کرتی اسی حالت نباتی میں رہ جاتی ہے اور عذاب اور عقوبت کی مستوجب ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس عالم حیوانی سے بھی اوپر اور بلند ایک اور درجہ ہے، اور وہ ایک ایسا وجود ہے کہ جو حرکت انتقالی اور حرکت ارادی کے علاوہ ایک اور قوت بھی رکھتا ہے جو دوسرے طبقات کے قویٰ سے بالاتر ہوتی ہے اور وہ قوۃ عقل ہے۔ یہ وجود انسان ہے۔ انسان حیوانات سے بھی اطاعت کا طالب ہوتا ہے۔ جو حیوان اطاعت نہیں کرتا تکلیف اٹھاتا ہے اور حیوانی حالت ہی میں رہتا ہے۔ جو حیوانات آدمی کی اطاعت کرتے ہیں اطاعت کا اجر پاتے ہیں اور حیوانی درجے سے ترقی کر کے انسانی درجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ انسان تمام موجودات، یعنی جمادات نباتات اور حیوانات کا بادشاہ ہے اور تمام عالم پر مسلط ہے اور ہر شے کو مسخر کر سکتا ہے لیکن ہم نے ابھی کہا تھا کہ نفس عاقلہ، کائنات کی عالی ترین اور شریف ترین حاصل ہے اور ہم نے ثابت کیا تھا کہ انسان سے نیچے کوئی پست درجہ کی شے ضائع نہیں ہوتی ان معنوں میں کہ ہر ایک شے کے مقابل ایک بلند درجہ موجود ہوتا ہے جہاں ترقی کر کے یہ شے پہنچ سکتی ہے اور بہترین بن سکتی ہے۔ اگر پست اور کرخت درجے ضائع نہیں ہو سکتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ نفس عاقلہ اپنی بلندی اور شرافت کے باوجود ضائع ہو جاتے۔ پس اس سے بھی بلند تر ایک درجہ ہے جہاں انسان پہنچ سکتا ہے، وہ درجہ انسان سے اطاعت و طاعت کا خواہاں ہے۔ بعض انسان اس

اطاعت سے روگردانی کرتے ہیں اور معصیت کا شکار ہوتے ہیں اس بنا پر انھیں عقوبت پہنچتی ہے اور وہ عقوبت یہ ہے کہ وہ انسانی درجے پر ہی رہتے ہیں لیکن جو لوگ طاعت و اطاعت کرتے ہیں، ثواب پاتے ہیں، اور جس طرح پست درجوں میں اطاعت کا ثواب یا صلہ یہ ہوتا ہے کہ ہر وجود اپنے سے بلند تر درجے کی طرف ترقی کرتا ہے (یعنی جمادات سے نباتات، نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان بنتا ہے) ناچار انسان بھی اپنے صانع کی اطاعت و طاعت سے آدمی کے درجے سے ترقی کر کے صانع تک پہنچتا ہے۔ صانع عالم نے بنی نوع انسان کو اس کائنات کا بادشاہ بنایا ہے اور زمین پر اس کو اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ اگر انسان اپنی علمی اور عملی قوتوں کو بروئے کار لائے اور اپنے خدا کی اطاعت و بندگی کرے تو اس کا نفس عاقلہ صانع عالم کے ملک باطن پر بھی بادشاہ ہو جائے۔[1]

یہ وہی مطالب ہیں جو مولوی رومی نے اپنی مثنوی میں بیان کیے ہیں اور بار بار اُن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان اشعار میں سے یہ اشعار معروف ہیں:

از جمادی مردم و نامی شدم
و ز نما مردم بحیوان سرزدم

وغیرہ وغیرہ اور اسی طرح ایک اور موضوع کے سلسلے میں یہ اشعار معروف ہیں:

آمدہ اول باقلیم جماد و ز جمادی در نباتی اوفتاد

---

[1] ۔ اس خیال کی بنیاد حکیم اوریگینس کے عقیدے پر ہے جو تیسری صدی عیسوی کا فلسفی ہے۔ فلوطینس اور فرفوریوس نے بھی اسی عقیدے کو اپنایا تھا۔ وہیں سے مسلمانوں میں آیا۔ حکیم ناصر خسرو نے اپنی کتاب "زاد المسافرین" میں انہی مطالب کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ میرا بیان وہیں سے ماخوذ ہے۔

سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چون بحیوانی فتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہمیں میلی کہ دارد سوی آن — خاصہ در وقت بہار و ضیمران
ہمچو میل کودکان با مادران — سر میل خود نداند در لبان
باز از حیوان سوی انسانیش — میکشد آن خالقی کہ دانیش
ہمچنین اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنون عاقل و دانا و زفت
عقلہای اولینش یاد نیست — ہم ازین عقلش تحول کرد نیست

تا دہد زین عقل پر حرص و طلب
صد ہزاران عقل بیند بوالعجب

علامہ اقبال مولانائے روم کے شاگرد اور پیرو ہیں۔ انھوں نے تمام عکماتے اسلام کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ انہی کے خیالات اور مفہوم کو وہ اسرار خودی میں نئے انداز میں پیش کرتے ہیں اور اس انسان کامل کا جس کی تعریف میں تمام عرفا اور متصوفین رطب اللسان ہیں اور لفظ پیر سے خطاب کرتے ہیں یوں ذکر کرتے ہیں:

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب
از خود آگاہی ید اللہی کند
از ید اللہی شہنشاہی کند

اور پھر انسان کو یوں تعلیم دیتے ہیں:

سنگ شو ای ہمچو گل نازک بدن — تا شوی بنیاد دیوار چمن
از گل خود آدمی تعمیر کن — آدمی را عالمی تعمیر کن

نالہ و فریاد و ماتم تا کجا ؟ سینہ کوبہای پیہم تا کجا ؟
در عمل پوشیدہ مضمون حیات لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جہان تازہ شو شعلہ در بر کن ، خلیل آوارہ شو
با جہان نامساعد ساختن ہست در میدان سپر انداختن
مرد خود داری کہ باشد پختہ کار با مزاج او بساز در روزگار
گر نسازد با مزاج او جہان میشود جنگ آزما با آسمان
بر کند بنیاد موجودات را میدہد ترکیب نو ذرات را
گردش ایام را برہم زند چرخ نیلی فام را برہم زند
میکند از قوت خود آشکار روزگار نو کہ باشد سازگار
در جہان نتوان اگر مرد از زیست ہمچو مردان جان سپردن زندگیست
ای ز آداب امانت بیخبر ! از دو عالم خویش را بہتر شمر
از رموز زندگی آگاہ شو ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو
چشم و گوش و لب کشا ای ہوشمند گر نبینی راہ حق ، بر من بخند
فارغ از اندیشہ اغیار شو قوت خوابیدہ ای ، بیدار شو
سنگ چون بر خود گمان شیشہ کرد شیشہ گر دید و شکستن پیشہ کرد
خویش را چون از خودی محکم کنی تو اگر خواہی جہان بر ہم کنی
گر فنا خواہی ز خود آزاد شو گر بقا خواہی بخود آباد شو

از خودی اندیش و مرد کار شو
مرد حق شو ، حامل اسرار شو

آپ نے دیکھا کہ علامہ موصوف ہمیشہ سعی و عمل کی ترغیب و تلقین کرتے ہیں ، اور کاہلی ، سستی نفس ، عزلت گزینی اور تقدیر کے آگے سر جھکا دینے سے روکتے

ہیں، یہاں تک کہ وہ تقدیر کو بھی انسان ہی کے دستِ قدرت کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ ان معنوں میں کہ انسان خدا سے دوسری تقدیر کا مطالبہ کر سکتا ہے اور جو کچھ مقدر ہو چکا ہو اُسے بدلوا سکتا ہے۔ "ضربِ کلیم" میں اُن کا ایک اردو شعر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ نباتات، جمادات تو اسیرِ تقدیر ہیں لیکن مومن فقط احکامِ الٰہی کا پابند ہے۔ "جاوید نامہ" میں کرۂ مریخ کے ایک حکیم کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گر زیک تقدیر خون گردد جگر
خواہ از حق حکم تقدیر دگر
تو اگر تقدیر نو خواہی رواست
زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست
ارضیان نقدِ خودی درباختند
نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمزِ باریکش بحرفی مضمر است
تو اگر دیگر شوی، او دیگر است
خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا
سنگ شو، برشیشہ اندازد ترا
تا بخود ناساختن ایمان تست
عالمِ افکار تو زندان تست
نوعِ دیگر بین جہانِ دیگر شود
این زمین و آسمان دیگر شود

"جاوید نامہ" میں ایک اور جگہ حلاج کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ جو کچھ

بزرگوں اور صاحب ہمت لوگوں نے جبر و تقدیر کا مفہوم سمجھا تھا وہ ہم کمزور انسانوں کے تصور سے مختلف تھا، جس پر ہم نے تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کیا ہوا ہے:

جبر خالد عالمی برھم زند
جبر ما بیخ و بن ما بر کند
کار مردان است تسلیم و رضا
بر ضعیفان راست ناید این قبا
کار ما غیر از امید و بیم نیست
ہر کسی را ہمت تسلیم نیست
ای کہ گوئی، بودنی این بود، شد
کار ہا پابند آئین بود، شد
معنی تقدیر کم فہمیدہ ای
فی خودی رانی خدا را دیدہ ای
مرد مومن با خدا دارد نیاز
با تو ما سازیم تو با ما بساز
عزم او خلاق تقدیر حق است
روز ہیجا تیر او تیر حق است

اور پھر "اسرار خودی" میں بیان کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو تقدیر کا مقید کر لیا ہے وہ غلامانہ فطرت رکھتے ہیں۔ آزاد وہ ہے جو حالات کو خود وضع کرتا ہے۔ عبد جو کچھ زندگی میں پیش آئے اس پر سر جھکاتا ہے اور ہر ہر لحظہ ایک نئی چیز پیدا کرتا ہے:

عبد را تحصیل حاصل فطرت است
واردات جان او بی قدرت است
دم بدم نو آفرینی کار حر
نغمہ پی ہم تازہ ریز د تار حر
فطرتش زحمت کش تکرار نیست
جادۂ او حلقۂ پرکار نیست
عبد را ایام زنجیر است و بس
بر لب او حرف تقدیر است و بس
ہمت حر با قضا گردد مشیر
حادثات از دست او صورت پذیر

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ آدمی کو چاہیے کہ اپنے آپ سے مایوس نہ ہو اور اپنے آپ کو حقارت سے نہ دیکھے۔ انسان میں قوت نظر، مشاہدہ، دقت بینی، بصیرت اور تبحر و تعمق ودیعت کیا گیا ہے تاکہ وہ فطرت کا نظارہ کرے اور اسے معلوم ہو سکے کہ پہنائے کائنات میں اُس کے سوا اور کوئی شے نہیں:

بیا با شاہد فطرت نظر باز
چرا در گوشۂ خلوت نشینی
ترا حق داد چشم پاک بینی
کہ از نورش نگاہی آفرینی
ضمیر کن فکان غیر از تو کس نیست
نشان بی نشان غیر از تو کس نیست

قدم بیباک تر نہ در رہ زیست

بہ پہنائے جہان غیر از تو کس نیست

یہاں تک کہ ماہِ نو بھی اپنی لاغری اور اپنی کمزوری کے باوجود اتنی قوت رکھتا ہے کہ راہِ کمال کے مختلف مدارج طے کر کے رفتہ رفتہ ماہ تمام بن جائے :

بہرحال جو کچھ کسی سے بن پڑے سعی وعمل سے کام لے :-

سحر در شاخسارے بوستانی

چہ خوش میگفت مرغ نغمہ خوانی

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری

سرودی، نالہ ای، آہی، فغانی

اگر تجھے شبنم بنایا گیا ہے تو برگ گل پر ٹپک، اگر کانٹا ہے تو اپنی خلش کو جاری رکھ۔ اگر تو بت پرست اور کافر ہے تو بت خانہ اور زنار کے شایان شان ہو جا۔ اپنے آپ میں ڈوب جا اور شراب تلخ کی طرح اُبھر کر دلوں کو گرما دے :

دانۂ سبحہ بہ زنار کشیدن آموز

گر نگاہ تو دو بین است ندیدن آموز

باز خلوت کدۂ غنچہ بروں زن چو شمیم

با نسیم سحر آمیز و وزیدن آموز

آفریدند اگر شبنم بی مایہ ترا

خیز و بر داغ دل لالہ چکیدن آموز

اگرت خار گل تازہ رسی ساختہ اند

پاس ناموس چمن دار و خلیدن آموز

باغبان گر ز خیابان تو بر کند ترا
صفت سبزہ دگر بارہ دمیدن آموز
تا تو سوزندہ تر و تلخ تر آئی بیرون
عزلت خلکدہ ای گیر و رسیدن آموز

اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ جہان فانی ہے اور انسانی زندگی ایک لمحے سے زیادہ نہیں اور اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں، ان سے خطاب کرتے ہیں:

جہان ما ہمہ خاک است و بی سپر گردد
ندانم اینکہ نفس ہای رفتہ بر گردد
نگاہ شوق و خیال بلند و ذوق وجود
مترس از اینکہ ہمہ خاک رہگذر گردد
چنان بزی کہ اگر مرگ ماست مرگ مدام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

علامہ اقبال کے فلسفیانہ تعلیمات اور اجتماعی افکار کے بنیادی اصول "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" میں درج ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا اول الذکر کتاب میں وہ فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو پہچان لے اور پالے۔ دوسری کتاب کا موضوع یہ ہے کہ جب تو نے اپنی خودی کو پا لیا تو پھر اپنے آپ کو ملت میں کھو دے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرد مسلمان کی ملت خود جمعیت اسلام ہے نہ کہ یہ مملکت اور وہ مملکت۔ اور بے خودی (یعنی اپنی خودی کو جمعیت اسلامی میں گم کر دینا) بھی درحقیقت نفس کی تربیت، تہذیب اور وسعت اور نشوونما ہی کے مختلف مرحلوں میں سے ایک مرحلہ ہے۔ غرض یہاں خودی سے مراد نفس ملی اور جمعیت اسلامی کی خودی ہے اور وہاں شخصی خودی اور انفرادی تشخص و تعین مقصود ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا

میں اخوت اسلامی کی واحد جمعیت قائم ہو، جو آزاد اور غیر محکوم ہو، اور اس کے اجزا کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے والا رشتہ عشق خدا اور ایمان بہ پیغمبر ہو، اور اس کا مرکز کعبہ ہو۔ علامہ اپنے مطالب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ فرد کو ملت سے وابستہ ہونا چاہیے۔ ملت افراد ہی کے اختلاط سے وجود میں آتی ہے، اور ملت کا ارتباط دو رکن سے ہوتا ہے، توحید اور نبوت۔ یاس، خوف اور حزن، قاطع حیات ہیں اور ان سب کا ازالہ توحید سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا جس نے ہمیں توحید کے راز سے آگاہ کیا۔ ہم اس کے احکام کی پیروی سے باہم متحد ہو گئے۔ ان کی رسالت کا مقصد یہ تھا کہ بنی آدم میں حریت، مساوات اور اخوت کی بنیاد قائم ہو۔ دین ملت محمدی مکان و زمان سے بالا ہیں، اور وطن اساس ملت نہیں، ملت کا نظام آئین سے ہوتا ہے۔ ملت محمدی کا آئین قرآن ہے۔ اس انحطاط کے دور میں ہمارے لیے یہی بہترین صورت ہے کہ ہم سابقین کی اقتدا اور تقلید کریں، اور اجتہاد کا دعویٰ نہ کریں۔ سیرت ملی کی پختگی کا انحصار آئین الٰہی کا اتباع ہے۔ سیرت ملی کے حسن کا دارو مدار آداب محمدی کی پیروی پر ہے۔ حیات ملی ایک ظاہری مرکز کی محتاج ہوتی ہے۔ مرکز ملت اسلامی مکہ ہے۔ اس امت کا مقصد توحید کی حفاظت اور اشاعت ہونا چاہیے۔ حیات ملی کی وسعت تو اے نظام عالم کی تسخیر ہے اور یہیں حیات ملت کی تکمیل ہوتی ہے کہ ملت میں فرد کی طرح احساس خودی پیدا ہوتا ہے۔ روایات ملی کی تدوین اور تاریخ گزشتہ کا تتبع اس احساس کی تکمیل کا باعث بنتا ہے۔ بقای نوع کا ظہور ازدواج اور امومت سے ہوتا ہے۔ چونکہ ہم سابقہ صفحات میں "رموزِ بے خودی" کے بہت سے اشعار نقل کر چکے ہیں اس لیے یہاں صرف پڑھنے والوں کے لیے چند متفرق اشعار درج کرتے ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر اُو را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونق ہنگامۂ احرار باش
حرز جان کن گفتۂ خیر البشر — ہست شیطان از جماعت دور تر
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می گیرد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
در دلش ذوق نمود از ملت است — احتساب کار اُو از ملت است
پختہ تر از گرمی صحبت شود — تا بمعنی فرد ہم ملت شود
فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوتش آشفتگی را مائل است
فطرتش وارفتۂ یکتائی است[1]
حفظ اُو از انجمن آرائی است

درجہان کیف و کم گردید عقل — پی بمنزل برد از توحید عقل
ملت از یک زندگی دلہاستی — روشن از یک جلوۂ سیناستی
قوم را اندیشہ ہا باید یکی — در ضمیرش مدعا باید یکی
جذبہ باید در سرشت او یکی — ہم عیار خوب و زشت او یکی
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ — باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
برنسب نازان شدن نادانی است — حکم اُو اندر تن و تن فانی است
مرگ را ساماں ز قطع آرزوست — زندگانی محکم از لاتقنطوا است
حق تعالیٰ پیکر ما آفرید — وز رسالت در تن ما جان دمید
جوہر ما با مقامی بستہ نیست — بادۂ تندش بجامی بستہ نیست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مرز و بوم ما بجز اسلام نیست

---

[1] ۔ یعنی تنہا رہنے سے وہ انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے (مصنف)

مسلم استی دل باقلیمی مبند — گم مشو اندر جهان چون و چند
دل بدست آور که در پهنای دل — میشود گم این سرای آب و گل
تا وطن را شمع محفل ساختند — نوع انسان را قبائل ساختند
روح از تن رفت و هفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند

ملتی را رفت چون آئین ز دست
مثل خاک اجزای اُو از هم گست

گر تو میخواهی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بقرآن زیستن
صوفی پشمینه پوش حال مست — از شراب نغمۂ قوال مست
آتش شعر عراقی در دلش — در نمیسازد بقرآن محفلش
از کلاه و بوریا، تاج و سریر — فقر اُو از خانقاہان باج گیر
واعظ دستان زن افسانه بند — معنی اُو پست و حرف اُو بلند

از خطیب و دیلمی گفتار اُو
با ضعیف و شاذ و مرسل کار اُو

مضمحل گردد چو تقویم حیات — ملت از تقلید می گیرد ثبات
راه آبا رو که این جمعیت است — معنی تقلید ضبط ملت است
بحر گم کردی زیان اندیش باش — حافظ جوی کم آب خویش باش

از یک آیینی مسلمان زنده است
پیکر ملت ز قرآن زنده است

اجتهاد اندر زمان انحطاط — قوم را برهم همی پیچد بساط
ز اجتهاد عالمانِ کم نظر — اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
طینت پاک مسلمان گوهر است — آب و تابش از یم پیغمبر است

عبرتی ای مسلم روشن ضمیر   از مآل امت موسیٰ بگیر
داد چون آن قوم مرکز را ز دست   رشتهٔ جمعیت ملت گسست

ماسوا از بهر تسخیر است و بس
سینهٔ او عرضهٔ تیر است و بس

چیست تاریخ، ای ز خود بیگانه‌ای   داستانی، قصه‌ای، افسانه‌ای ؟
این ترا از خویشتن آگه کند   آشنای کار و مرد ره کند
همچو خنجر بر فسانت می زند   باز بر روی جهانت می زند
شعلهٔ افسرده در سوزش نگر   دوش در آغوش امروزش نگر
شمع او بخت امم را کوکب است   روشن از وی امشب و هم دیشب است
چشم پرکاری که بیند رفته را   پیش تو باز آفریند رفته را
ضبط کن تاریخ را پاینده شو   از نفسهای رمیده زنده شو
دوش را پیوند با امروز کن   زندگی را مرغ دست آموز کن
سر زند از ماضی تو حال تو   خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن، ار خواهی حیات لازوال   رشتهٔ ماضی ز استقبال و حال
موج ادراک تسلسل زندگیست   میکشان را شور قلقل زندگیست
نغمه خیز از زخمهٔ زن ساز مرد   از نیاز او دوبالا ناز مرد
پوشش عریانی مردان زن است   حسن دلجو عشق را پیراهن است
عشق حق پروردهٔ آغوش او   این نوا از زخمهٔ خاموش او
آنکه نازد بر وجودش کائنات   ذکر او فرمود با طیب و صلات [۱]

---

۱ ـ آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے کہ مجھے تین چیزیں بہت مرغوب ہیں ـ عورت، خوشبو اور نماز۔

مسلمی کو را پرستاری شمرد　　بہرہ ای از حکمت قرآن نبرد
گفت آن مقصود حرف کن فکان　　"زیر پای امہات آمد جنان"
قوم را سرمایہ ای صاحب نظر　　نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مال او فرزند ہای تندرست　　تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

حافظ رمز اخوت مادران
قوت قرآن و ملت مادران

اسلامی اخوت و مساوات اور حریت کے سلسلے میں وہ ایک حکایت نقل کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون اسلام میں حقوق کے لحاظ سے شاہ و گدا میں کوئی فرق نہیں۔ سلطان مراد شاہ کے حکم سے ایک معمار مسجد بناتا ہے۔ مسجد بادشاہ کو پسند نہیں آتی وہ اس معمار کے ہاتھ کٹوا دیتا ہے۔ معمار قاضی کے پاس شکایت لے جاتا ہے۔ قاضی سلطان کو اپنے حضور بلوا کر قصاص کا حکم دیتا ہے:

گفت قاضی فی القصاص آمد حیات
زندگی گیرد باین قانون ثبات
عبد مسلم کمتر از احرار نیست
خون شہ رنگین تر از معمار نیست
پیش قرآن بندہ و مولا یکی است
بوریا و مسند دیبا یکی است

پیام مشرق میں بھی ایک قطعہ اسی مضمون کا ہے کہ آدمی کو کسی کے آگے سر نہیں جھکانا چاہیے۔ جو شخصی بندگی کرتا ہے کتے سے بھی بدتر ہے:

آدم از بی بصری بندگی آدم کرد
گوہری داشت ولی نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوی غلامی زسگان خوار تراست
من ندیدم کہ سگی پیش سگی سر خم کرد

یہاں علامہ اقبال کی دوسری کتابوں کا مختصراً ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ "جاوید نامہ" جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ ہو چکا ہے، ایک داستان ہے جس میں وہ افلاک کی سیر کرتے ہیں اور گزشتگان کی ارواح سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہ کتاب ڈانٹے کی تصنیف "طربیہ خداوندی"[1] اور معری کی تصنیف "رسالۃ الغفران" وغیرہ کے طرز پر ہے۔ اس کا آغاز ان دو شعروں سے ہوتا ہے:

خیال من بہ تماشای آسمان بودہ است
بدوش ماہ و بآغوش کہکشان بودہ است
گماں مبر کہ ہمین خاکدان نشیمن است
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہان بودہ است

ایک حکایت لکھتے ہیں کہ ایک رات میں سمندر کے کنارے بیٹھا محو تفکر تھا اور دل ہی دل میں مولانا روم کی یہ غزل پڑھ رہا تھا:

زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

اچانک رومی کی روح آشکار ہوتی۔ میں نے اس سے کئی ایک سوالات پوچھے اور انھوں نے میرے مشکلات کا حل بیان کیا اور پھر فرمایا کہ ان نو آسمانوں سے

---

[1] Divina Commedia ۔

خائف نہ ہو، زمان و مکان بھی تیری روح کی حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔ اس کے بعد زروان جو زمان و مکان کی روح ہے، مجھے عالم بالا میں لے گئی۔

اس سیر روحانی کی داستان میں وہ اپنے آپ کو زندہ رود کے نام سے پکارتے ہیں، اور ہر جگہ ان کے رفیق راہ اور راہنما مولوی رومی ہیں جو طرح طرح کے حالات بیان کرتے جاتے ہیں۔ فلک قمر میں وہ عارفان ہندوستان میں سے ایک کو جو "جہان دوست" کے نام سے مشہور ہیں، ملتے ہیں۔ اسی طرح وادی یرغمید میں چار طاسین نبوت کو دیکھتے ہیں۔ پہلی طاسین گوتم یعنی مہاتما بدھ، دوسری طاسین زرتشت، تیسری طاسین مسیحؑ، چوتھی طاسین محمدیﷺ ہے۔ ٹالسٹائی کے خواب میں جو طاسین مسیحؑ ہے، دختر فرنگی[1] یہودا[2] اسخریوطی سے جو رود سیماب میں تیر رہا ہے، خطاب کرتی ہے کہ تو نے روح القدس کی قیمت کو نہ پہچانا۔ اور وہ جواب دیتا ہے کہ تمہارا جرم میرے جرم سے زیادہ سنگین ہے:

عقل و دین از کافری ہای تو خوار
عشق از سوداگری ہای تو خوار
حکمتی کو عقدہ اشیا کشاد
با تو غیر از فکر چنگیزی نداد

فلک عطارد میں جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی روحیں ظاہر ہوتی ہیں اور مولوی اور زندہ رود سے دیر تک بحث و گفتگو کرتی ہیں۔ سید جمال الدین، خلافت آدم، حکومت الٰہی، منافع علم و حکمت کی تشریح کرتے ہیں اور روسی

---

[1] ۔ مراد یورپ اور یورپین لوگ ہیں (مصنف)

[2] ۔ حضرت عیسیٰؑ کا وہ حواری جس نے اپنے آقا کے ساتھ غداری کی تھی اور دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ (مصنف)

قوم کے نام پیغام بھیجتے ہیں۔ فلک زہرہ میں وہ قدیم اقوام کے خداؤں کی محفل کو جنہیں اہل فرنگ نے تازہ زندگی عطا کی ہے، دیکھتے ہیں۔ انھیں کچنر[1] اور فرعون کی روحیں عذاب میں مبتلا نظر آتی ہیں کچنر عذر پیش کرتا ہے:

مقصد قوم فرنگ آمد بلند　　از پی لعل و گہر گوری نکند
سرگزشت مصر و فرعون و کلیم　　میتوان دیدن ز آثار قدیم
علم و حکمت کشف اسرار است و بس
حکمت بی جستجو خوار است و بس

فرعون کہتا ہے، میں نے مانا کہ تم لوگوں نے میری قبر کو تاریخی انکشافات کے لیے کھودا لیکن تربت مہدی سوڈانی میں کیا بات تھی؟ فلک مریخ میں علامہ دیکھتے ہیں کہ ایک دوشیزہ دعوئ رسالت کرتی ہے اور اہل مریخ میں سے ایک فلسفی بیان کرتا ہے کہ اس لڑکی کو فرز مرز (جو ابلیس کے ساتھیوں اور مددگاروں میں سے ہے) یورپ کی سرزمین سے چرا کر یہاں لایا ہے۔ یہ لڑکی واہی تباہی باتیں کرتی ہے جنھیں اہل یورپ کے اقوال کی نظیر کہنا چاہیے۔ اس کے خطبات میں ایک خطبہ یہ ہے:

ای زنان، ای خواہران، ای دختران
زیستن تا کی مثال دلبران
دلبری اندر جہان مظلومی است
دلبری محکومی و محرومی است

---

[1] ۔ Kitchener سوڈان کا حاکم اور مصر میں انگریزی فوجوں کا سردار، جس نے افریقہ میں بوئروں کے ساتھ جنگ کی۔ ترقی کر کے فیلڈ مارشل اور وزیر جنگ کے عہدے پر فائز ہوا۔ (مصنف)

مرد صیادی بہ نخچیری کند
گرد تو گردد کہ زنجیری کند

خود گدازی ہای او، مکر و فریب
درد و داغ و آرزو مکر و فریب

گرچہ آن کافر حرم سازد ترا
مبتلای درد و غم سازد ترا

ہمبر او بودن آزار حیات
وصل او زہر و فراق او نبات

از امومت زرد روی مادران
ای خنک آزادی بی شوہران

ظاہر ہے کہ اقبال اس طرح کی باتوں کے خلاف ہیں۔ فلک مشتری میں تین روحیں اُن کے سامنے آتی ہیں جنھوں نے بہشت کے ٹھکانے کی خواہش نہ کی اور جاودانی سرگردانی کی طرف مائل ہوئیں، اُن میں سے ایک حلاج ہیں، دوسرے غالب کاشمیری[1] اور تیسرے طاہرہ قرۃ العین۔ اُن میں سے ہر ایک، ایک غزل پڑھتا ہے، حلاج کہتا ہے:

زخاک خویش طلب آتشی کہ پیدا نیست
تجلّی دگری در خورِ تقاضا نیست

یہ غزل خود علامہ مرحوم کی ہے۔ غالب اپنی غزل پڑھتا ہے جس کا مطلع ہے:

---

[1] ۔ پھر وہی اشتباہ۔

بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا بگردش رطل گران بگردانیم

اور طاہرہ (جو کلامِ اقبال میں "خاتونِ عجم" کے نام سے مذکور ہے) اپنی یہ مشہور غزل پڑھتی ہیں:

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ رو برو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو

زندہ رود، اُن میں سے ہر ایک سے کسی نہ کسی مشکل مسئلے کی وضاحت چاہتے ہیں اور وہ جواب دیتے ہیں۔ ابھی وہ اس گفتگو سے فارغ نہیں ہوتے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا تاریک ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابلیس آجاتا ہے۔ اس ملاقات کا بیان اور ابلیس کی گفتار پڑھنے اور سننے کے قابل ہے۔ وہ متعدد اشارات جو اقبال اپنی مختلف کتابوں میں شیطان کے بارے میں کرتے ہیں، سب کے سب خاص پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر جو خدا سے خطاب کر کے کہا گیا ہے:

جرم ما از دانہ ای، تقصیر اُو از سجدہ ای
فی بہ آن بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی

فلک زحل میں روح ہندوستان ظاہر ہوتی ہے اور اُن تمام غداروں کا جو اس کی محکومی کا باعث ہوئے ہیں، شکوہ کرتی ہے۔ اور افلاک کے اس طرف جنت میں پہنچنے سے پہلے وہ جرمن فلسفی نٹشے کی روح کو دیکھتی ہے۔ وہ روح دونوں جہان کے درمیان ہے اور اس کی عقل اپنے آپ سے باتیں کرتی ہے۔ بہشت بریں میں قصر شرف النساء بیگم، دختر خان بہادر خان، حاکم پنجاب کو دیکھتے ہیں اور پھر سید علی ہمدانی، امیر کشمیر، سے پوچھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان نیک عمل کریں تو پھر اس نے شیطان کو کیوں پیدا کیا کہ جو ہماری نظروں میں زشت و بد کو

یوں آراستہ کرکے لاتا ہے؟ وہ جواب دیتے ہیں :

بندہ کز خویشتن دارد خبر
آفریند منفعت را از ضرر
بزم با دیواست آدم را وبال
رزم با دیواست آدم را جمال
خویش را براہرمن باید زدن
تو ہمہ تیغ، آن ہمہ سنگ فسن

اس کے بعد وہ مُلّا طاہر غنی کاشمیری اور بھرتری ہری سے باتیں کرتے ہیں۔ پھر وہ سلاطین مشرق کے محل میں نادرشاہ افشار، سلطان ابدالی افغانی اور ٹیپو سلطان پادشاہ دکن سے ملتے ہیں۔ ان کے مختلف بیانات میں سے جو حسن و جلال کے اعتبار سے اُن کی بلند شخصیت کے شایان شان ہیں، ایک یہ بھی ہے :

چیست ملت ای کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگہ
اہل حق را حجت و دعویٰ یکیست — خیمہ ہای ما جدا، دلہا یکیست
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب — یک نگہ شو تا شود حق بی حجاب
یک نگاہی را بچشم کم مبین — از تجلیہای توحید است این
مردہ ای از یک نگاہی زندہ شو — بگذر از بی مرکزی، پائندہ شو

وحدت افکار و کردار آفرین
تا شوی از رجہان، صاحب نگین

اس کے بعد وہ جنت سے رخصت ہو کر اس دنیا میں لوٹ آتے ہیں

زبور عجم، گلشن راز جدید اور بندگی نامہ، تینوں ایک ہی مجموعے میں چھپی ہیں۔ مقدم الذکر دو حصوں میں منقسم ہے اور اس میں ۱۴۱ قطعات، مسمطات اور غزلیں

ہیں۔ دوسری دو کتابیں مثنوی میں ہیں۔ گلشن راز جدید میں انھوں نے محمود شبستری کا تتبع کیا ہے۔ نو سوال وضع کیے ہیں اور پھر اُن کے جواب دیے ہیں۔ سوالات کا موضوع، تفکر، حیات واجب و ممکن، قدیم و محدث، من کیستم، جزو و کل، سالک و مرید، رمز انا الحق اور سر وحدت ہیں۔ یہ وہی سوالات ہیں جن پر ہزار ہا سال سے عارفوں، مفکروں اور فلسفیوں نے بحث کی ہے اور طرح طرح کے جواب دیے ہیں۔ ہم اس مجموعے سے چند منتخبات ناظرین کے لیے یہاں پیش کرتے ہیں:

نہ برون در گزشتم ز درون خانہ گفتم
سخن نگفتہ ای را چہ قلندرانہ گفتم

یا رب درون سینہ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آن نظر بدہ
خاکم بنور نغمۂ داؤد بر فروز
ہر ذرہ مرا پر و بال شرر بدہ

بر عقل فلک پیما تہ کانہ شبیخون بہ
یک ذرۂ درد دل از علم فلاطون بہ
آن فقر کہ بی تیغی صد کشور دل گیرد
از شوکت دارا بہ، از فر فریدون بہ
در جوی روان ما بی منت طوفانی
یک موج اگر خیزد آن موج ز جیحون بہ

یا مسلمان را مدہ فرمان کہ جان بر کف بنہ
یا درین فرسودہ پیکر تازہ جانی آفرین
یا چنان کن یا چنین

یا بکش در سینهٔ من آرزوی انقلاب
یا دگرگون کن نهاد این زمان و این زمان

یا چنان کن یا چنین

ساقیا بر جگرم شعلهٔ نمناک انداز
دگر آشوب قیامت بکف خاک انداز
او بیک دانهٔ گندم بزمینم انداخت
تو بیک جرعهٔ آب آن سوی افلاک انداز

یاد ایامی که خوردم باده ها با چنگ و نی
جام می در دست من، مینای می در دست وی
بی تو جان من چو آن سازی که تارش در گسست
در حضور از سینهٔ من نغمه خیز و پی به پی
آنچه من در بزم شوق آورده ام دانی که چیست؟
یک چمن گل، یک نیستان ناله، یک میخانه می
زنده کن باز آن محبت را که از نیروی او
بوریای ره نشینی در فتد با تخت کی

لالهٔ این چمن آلودهٔ رنگ است هنوز
سپر از دست مینداز که جنگ است هنوز
فتنه ای را که دو صد فتنه بآغوش بود
دختری هست که در مهد فرنگ است هنوز
ایکه آسوده نشینی لب ساحل، برخیز
که ترا کار بگرداب و نهنگ است هنوز

تکیه بر حجت و اعجاز بیان نیز کنند
کار حق گاه بشمشیر و سنان نیز کنند
گاه باشد که تهِ خرقه، زره می پوشند
عاشقان بندهٔ حال‌اند و چنان نیز کنند
چون جهان کهنه شود پاک بسوزند او را
وز همان آب و گل ایجاد جهان نیز کنند
عشق مانند متاعیست ببازار حیات
گاه ارزان بفروشند و گران نیز کنند
تا تو بیدار شوی ناله کشیدم ، ورنه
عشق کاریست که بی آه و فغان نیز کنند

عمرها در کعبه و بتخانه می نالد حیات تا ز بزم عشق یک دانای راز آید برون
طرح نو می افگند اندر ضمیر کائنات ناله ها کز سینهٔ اهل نیاز آید برون
چنگ را گیرید از دستم که کار از دست رفت
نغمه ام خون گشت و از رگهای ساز آید برون

گفتند جهان ما آیا بتو میسازد؟
گفتم که نمیسازد، گفتند که برهم زن

ای غنچهٔ خوابیده، چو نرگس نگران خیز
کاشانهٔ ما رفت بتاراج غمان، خیز
از نالهٔ مرغ چمن، از بانگ اذان خیز
گرمی هنگامهٔ آتش نفسان خیز

از خواب گران، خواب گران، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

خورشید کہ پیرایہ بسیمای سحر بست
آویزہ بگوشش سحر از خون جگر بست
از دشت و جبل قافلہ ہا رخت سفر بست
ای چشم جہان بین، بتماشای جہان خیز
از خواب گران، خواب گران، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

خاور ہمہ مانند غبار سر راہیست

یک نالۂ خاموش و اثر باختہ آہیست
ہر ذرۂ این خاک گرہ خوردہ نگاہیست
از ہند و سمرقند و عراق و ہمدان خیز
از خواب گران، خواب گران، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

دریای تو دریاست کہ آسودہ چو صحراست
دریای تو دریاست کہ افزون نشد و، کاست
بیگانہ آشوب و نہنگست، چہ دریاست!
از سینۂ چاکش صفت موج روان خیز
از خواب گران، خواب گران، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

ناموس ازل را، تو امینی ، تو امینی
دارای جهان را تو یساری تو یمینی
ای بندهٔ خاکی تو زمانی تو زمینی
صهبای یقین در کش و از دیر گمان خیز
از خواب گران ، خواب گران ، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

فریاد ز افرنگ و دلآویزیِ افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزیِ افرنگ
عالم همه ویرانه ز چنگیزیِ افرنگ
معمار حرم ! باز بتعمیر جهان خیز
از خواب گران ، خواب گران ، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

زندگی در صدف خویش گهر ساختن است
در دل شعله فرو رفتن و نگداختن است
عشق ازین گنبد در بسته برون تاختن است
شیشه و ماه ز طاق فلک انداختن است
سلطنت نقد دل و دین زکف انداختن است
بیخی داو جهان بردن و جان باختن است
حکمت و فلسفه را همت مردی باید
تیغ اندیشه بروی دو جهان آختن است
مذهب زنده دلان خواب پریشانی نیست
از همین خاک جهان دگری ساختن است

نیابی در جهان یاری که داند دلنوازی را
بخود گم شو، نگه دار آبروی عشقبازی ر

من آن علم و فراست با پرکاهی نمی گیرم
که از تیغ و سپر بیگانه سازد مرد غازی ر

بهر زخی که این کالا بگیری سودمند افتد
بزور بازوی حیدر بده ادراک رازی ر

اگر یک قطره خون داری، اگر مشت پری داری
بیا من با تو آموزم طریق شاهبازی را

اگر این کار را کار نفس دانی چه نادانی!
دم شمشیر اندر سینه باید نی نوازی را

بدرگاه سلاطین تا کجا این چهره سائیها
بیاموز از خدای خویش ناز کبریائیها

بیا بر لاله پا کوبیم و بیباکانه می نوشیم
که عاشق را بحل کردند خون پارسائیها

خود را کنم سجودی، دیر و حرم نمانده
این در عرب نمانده، آن در عجم نمانده

در برگ لاله و گل آن رنگ و نم نمانده
در ناله های مرغان آن زیر و بم نمانده

بی منزل آرمیدند، پا از طلب کشیدند
شاید که خاکیان را در سینه دم نمانده

گلشن راز جدید:

نپنداری کر من بی باده مستم
مثال شاعران افسانه بستم
نبینی خیراز آن مرد فرودست
کر برمن تهمت شعروسخن بست
بجوی دلبران کاری ندارم
دل زاری، غم یاری ندارم
دل سنگ اززجاج من بلرزد
یم افکار من ساحل نه ورزد
نهان تقدیر ها در پردهٔ من
قیامت ها بغل پروردهٔ من
دمی درخویشتن خلوت گزیدم
جهان لا زوالی آفریدم
مرازین شاعری خود عار ناید
کر درصد قرن یک عطار ناید
بجانم رزم مرگ و زندگانیست
نگاهم بر حیات جاودانیست
زجان خاک ترا بیگانه دیدم
باندام تو جان خود دمیدم
شراری جسته ای گیر از درونم
کر من مانند رومی گرم خونم
وگرنه آتش از تهذیب نوگیر
برون خود بیفروز اندرون میر!

بندگی نامہ۔ سرزمین مشرق کے فنون جدیدہ موسیقی اور مصوری کے بارے میں:

از غلامی دل بمیرد در بدن — از غلامی روح گردد بار تن
مرگہا اندر فنون بندگی — من چہ گویم از فسون بندگی
نغمۂ او خالی از تار حیات — ہمچو سیل افتد بدیوار حیات
از نی او آشکارا راز او — مرگ یک شہر است اندر ساز او
ناتوان و زار میسازد ترا — از جہان بیزار میسازد ترا
من نمی گویم کہ آہنگش خطاست — بیوہ زن را این چنین شیون رواست
نغمہ باید تند رو مانند سیل — تا برد از دل غمان را خیل خیل
نغمۂ روشن چراغ فطرت است — معنی او نقش بند صورت است
نغمہ گر معنی ندارد مردہ ایست — سوز او از آتش افسردہ ایست
"معنی آن باشد کہ بستاند ترا — بی نیاز از نقش گرداند ترا
معنی آن نبود کہ کور و کر کند — مرد را بر نقش عاشق تر کند"
مطرب ما جلوۂ معنی ندید — دل بصورت بست و از معنی درید
زندگی بی قوت اعجاز نیست — ہر کسی دانندۂ این راز نیست
آن ہنرمندی کہ بر فطرت فزود — راز خود را بر نگاہ ما گشود
آفرینندہ کائنات دیگری — قلب را بخشد حیات دیگری
در غلامی عشق جز گفتار نیست — کار ما گفتار ما را یار نیست
دین و دانش را غلام ارزان دہد — تا بدن را زندہ داود، جان دہد
یک زمان با رفتگان صحبت گزین — صنعت آزاد مردان ہم ببین
خویش را از خود برون آوردہ اند — این چنین خود را تماشا کردہ اند
در من آن نیروی الا اللہ نیست — سجدہ ام شایان این درگاہ نیست
عشق مردان نقد خوبان را عیار — حسن را ہم پردہ در، ہم پردہ دار

از محبت جذبہ ہا گردد بلند　　ارج میگیرد ازو نا ارجمند
بی محبت زندگی ماتم ہمہ　　کار و بارش زشت و نا محکم ہمہ
عشق صیقل میزند فرہنگ را　　جوہر آئینہ بخشد سنگ را
گرمی افکار ما از نار اوست　　آفریدن، جان دمیدن کار اوست
عشق مور و مرغ و آدم را بس است　　عشق تنہا ہر دو عالم را بس است
دلبری بی قاہری جادوگری است　　دلبری با قاہری پیغمبری است

ہر دو را در کار ہا آمیخت عشق
عالمی در عالمی انگیخت عشق

"پیام مشرق" کا پہلے تعارف کرا چکا ہوں اور اس میں سے مختلف موضوعات پر شعر بھی نقل کیے گئے ہیں۔ یہاں ایک غزل مستزاد "کرم شب تاب"[1] پر اکتفا کی جاتی ہے:

یک ذرۂ بی مایہ متاع نفس اندوخت
شوق این قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت

پہنای شب افروخت
واماندہ شعاعی کہ گرہ خورد و شرر شد
از سوز حیا تست کہ کارش ہمہ زر شد
دارای نظر شد

پروانۂ بی تاب کہ ہر سو تنگ و پو کرد
بر شمع چنان سوخت کہ خود را ہمہ او کرد
ترک من و تو کرد

---

[1] ۔ عنوان نظم "کرمک شب تاب" ہے۔ مصنف اسے غزل مستزاد کہہ کر پکارتا ہے۔ اصطلاحاً یہ نظم غزلِ مستزاد سے قدرے مختلف ہے اور اسے جدید طرز کی نظموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ (مترجم)

ای کرمک شب تاب سراپای تو نوراست
پرواز تو یک سلسلۂ غیب و حضوراست
آئین ظهوراست

در تیرہ شبان، مشعل مرغان شب استی
آن سوز چہ سوزاست کہ در تاب و تب استی
گرم طلب استی

مائیم کہ مانند تو از خاک دمیدیم
دیدیم تپیدیم، ندیدیم تپیدیم
جائی نرسیدیم

گویم سخن پختہ و پروردہ و تہ دار
از منزل گم گشتہ مگو، پای برہ دار
این جلوہ نگہ دار

کتاب "مسافر" ایک سفر کی داستان ہے جب علامہ مرحوم ۱۹۳۳ء میں افغانستان میں گئے تھے اور اُن اشعار پر مشتمل ہے جو انھوں نے سرحد کے لوگوں سے خطاب کر کے کہے۔ اس کتاب میں اور بھی قطعات ہیں جن کے عنوان حسب ذیل ہیں: درحضور شاہ شہید (ٹیپو سلطان) بابر، حکیم سنائی، سلطان محمود غزنوی، احمد شاہ بابا کی قبروں کی زیارت کے متعلق، خطاب بہ سلطان ظاہر شاہ افغان۔ یہ کتاب ایک اور کتاب کے ہمراہ چھپی ہے، جس کا نام "پس چہ باید کرد ای اقوام شرق" ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مثنوی ہے جس میں دیار حبش پر اطالوی حملے کا تذکرہ ہے۔ اس میں اور بھی اشعار ہیں؛ حکمتِ موسیٰ، حکمتِ فرعون۔ لا الٰہ الا اللہ، فقر، مردِ آزاد، اسرارِ شریعت، یہ چند شعر اسی کتاب سے ہیں:

امتان را زندگی جذب درون
کم نظر این جذبہ را گوید جنون
مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد این دو جوہر کافر است
عصر ما مارا ز ما بیگانہ کرد
از جمال مصطفیٰؐ بیگانہ کرد
تا خودی در سینۂ ملت بمرد
کوہ کاہے کرد و باد او را ببرد

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گردون رسم لادینی نہاد

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست
من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است
درون دیدہ نگہ دارم اشک خونین را
کہ ان فقیرم و این دولت خداداد است

"ارمغان حجاز" جو اُن کی وفات کے بعد چھپی تھی، دو زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ اس کی تین چوتھائی فارسی میں ہے اور ایک چوتھائی اردو میں۔ فارسی حصے میں ۳۹۴ رباعیاں[1] ہیں جن کے الگ الگ موضوع ہیں مثلاً خودی، انا الحق، صوفی،

---

[1] ۔ اصطلاحاً انہیں قطعات کہنا چاہیے کہ رباعی کا وزن مخصوص ہوتا ہے۔ لیکن علامہ مرحوم اس خصوصیت کے پابند نہیں تھے اور سہولت کے اعتبار سے ان قطعات کو رباعیات کہتے تھے۔

ملا، شعرای عرب، خلافت، ملوکیت، ترک عثمانی، دختران ملت، تعلیم، تلاش رزق، جبر و اختیار، موت و ابلیس، چند رباعیان حسب ذیل ہیں:

جہان از خود برون آوردۂ کیست — جمالش جلوۂ بی پردۂ کیست
مرا گوئی کہ از شیطان حذر کن — بگو با من کہ او پروردۂ کیست

○

متاع من دل دردآشنای است — نصیب من فغان نارسای است
بخاک مرقد من لالہ خوشتر — کہ ہم خاموش و ہم خونین نوای است

○

نداند جبرئیل این ہای و ہو را — کہ نشناسد مقام جستجو را
بپرس از بندۂ بیچارۂ خویش — کہ داند نیش و نوش آرزو را

○

مسلمان فاقہ مست و ژندہ پوش است — ز کارش جبرئیل اندر خروش است
بیا نقش دگر ملت بریزیم — کہ این ملت جہان را بار دوش است

○

مریدی فاقہ مستی گفت با شیخ — کہ یزدان را ز حال ما خبر نیست
بما نزدیک تر از شہ رگ ماست — ولیکن از شکم نزدیک تر نیست

○

بدن واماند و جانم در تنگ و پوست — سوی شہری کہ بطحی در رہ اوست
تو باش اینجا و با خاصان بیامیز — کہ من دارم ہوای منزل دوست

○

امیر کاروان آن اعجمی کیست! — سرود او با بنگ عرب نیست
زند آن نغمہ کز سیرابی او — خنک دل در بیابانی تواں زیست

دل خود را اسیر رنگ و بو کرد　　تهی از ذوق و شوق و آرزو کرد
صفیر شاهبازان کم شناسد　　کر گوشش با طنین پشه خو کرد

○

شبی پیش خدا بگریستم زار　　مسلمانان چرا زارند و خوارند
ندا آمد: "نمیدانی که این قوم　　دلی دارند و محبوبی ندارند"

○

نه شعر است اینکه بر وی دل نهادم　　گره از رشتهٔ معنی گشادم
بامیدی که اکسیری زند عشق　　مس این مفلسان را تاب دادم

○

تو گفتی: از حیات جاودان گوی　　بگوش مرده ای پیغام جان گوی
ولی گویند این ناحق شناسان　　کز تاریخ وفات این و آن گوی

○

غریبی، دردمندی، نی نوازی　　ز سوز نغمه ای خود رو گذاری
تو میدانی چه می جوید، چه خواهد　　دلی از هر دو عالم بی نیازی

○

می از میخانهٔ مغرب چشیدم　　بجان من که درد سر خریدم
نشستم با نکویان فرنگی　　از آن بی سود تر روزی ندیدم

○

غریبم در میان محفل خویش　　تو خود گو با که گویم مشکل خویش
از آن ترسم که پنهانم شود فاش　　غم خود را نگویم با دل خویش

○

نگیرد لاله و گل رنگ و بویم　　درون سینه ام مرد آرزویم
غم پنهان بحرف اندر نگنجد　　اگر گنجد چه گویم با که گویم

○

چو رومی در حرم دادم اذان من　　ازو آموختم اسرار جان من
به دور فتنهٔ عصر کهن، او　　به دور فتنهٔ عصر روان، من

○

خدا آن ملتی را سروری داد　　که تقدیرش بدست خویش بنوشت
بان ملت سروکاری ندارد　　که دهقانش برای دیگران کشت

○

اناالحق جز مقام کبریا نیست　　سزای او چلیپا هست یا نیست
اگر فردی بگوید سرزنش به　　اگر قومی بگوید ناروا نیست

○

به بند صوفی و ملا اسیری　　حیات از حکمت قرآن نگیری
بآیاتش ترا کاری جز این نیست　　که از یاسین او آسان بمیری

○

بکام خود دگر آن کهنه می ریز　　که با جامش نیرزد ملک پرویز
ز اشعار جلال الدین رومی　　بدیوار حریم دل بیاویز

○

بگیر از ساغرش آن لاله رنگی　　که تاثیرش دهد لعلی بسنگی
غزالی را دل شیری ببخشد　　بشوید داغ از پشت پلنگی

○

نصیبی بردم از تاب و تب او — شبم مانند روز از کوکب او
غزالی در بیابان حرم بین — که ریزد خندهٔ شیر از لب او

خیالش با مه و انجم نشیند — نگاهش آن سوی پروین ببیند
دل بی تاب خود را پیش او نه — دم او رعشه از سیماب چیند

ز رومی گیر اسرار فقیری — که آن فقر است محسود امیری
حذر زان فقر و درویشی که از وی — رسیدی بر مقام سربزیری

می روشن ز تاک من فرو ریخت — خوشا مردی که در دامانم آویخت
نصیب از آتشی دارم که اول — سنائی از دل رومی برانگیخت

دو صد فتنه را بر خود کشادی — دو گامی رفتی و از پا فتادی
برهمن از بتان طاق خود آراست — تو قرآن را سر طاقی نهادی

نگه دارد برهمن کار خود را — نمیگوید بکس اسرار خود را
بمن گوید که از تسبیح بگذر — بدوش خود برد زنار خود را

نهنگی بچهٔ خود را چه خوش گفت — بدین ما حرام آمد کرانه
بموج آویز و از ساحل بپرهیز — همه دریاست ما را آشیانه

پریشان ہر دم ما از غمی چند — شریک ہر غمی نامحرمی چند
ولیکن طرح فردای تو آن ریخت — اگر دانی بہای این دمی چند

○

برون کن کینہ را از سینۂ خویش — کہ دود خانہ از روزن برون بہ
زکشتِ دل مدہ کس را خراجی — مشو ای دہخدا غارت گرِ دہ

○

بشر تا از مقام خود فتادست — بقدر محکمی اُو را کشادست
گنہ ہم می شود بی لذت و سرد — اگر ابلیس تو خاکی نہادست

○

مشو پنجیر ابلیسانِ این عصر — خسان را غمزۂ شان سازگار است
اصیلان را ہمان ابلیس خوشتر — کہ یزدان دیدہ و کامل عیار است

○

حریف ضرب اُو مرد تمام است — کہ آن آتش نسب والا مقام است
نہ ہر خاکی سزاوار نخ اوست — کہ صید لاغری بروی حرام است

○

مقام شوق بی صدق و یقین نیست — یقین بی صحبت روح الامین نیست
گر از صدق و یقین داری نصیبی — قدم بی باک نہ کس در کمین نیست

○

بہشتی بہر پاکان حرم ہست — بہشتی بہر ارباب ہمم ہست
بگو ہندی مسلمان را کہ خوش باش — بہشتی فی سبیل اللہ ہم ہست

خاتمے کے طور پر ہم جاوید نامے کے ان اشعار سے پڑھنے والوں کے دماغ کو معطر کرنا چاہتے ہیں:

زنده ای یا مرده ای یا جان بلب
از سه شاهد کن شهادت را طلب
شاهد اول شعور خویشتن
خویش را دیدن بنور خویشتن
شاهد ثانی شعور دیگری
خویش را دیدن بنور دیگری
شاهد ثالث شعور ذات حق
خویش را دیدن بنور ذات حق
پیش این نور ار بمانی استوار
حی و قائم چون خدا خود را شمار
بر مقام خود رسیدن زندگی است
ذات را بی پرده دیدن زندگی است
مرد مومن در نسازد با صفات
مصطفیؐ راضی نشد الا بذات
چیست معراج؟ آرزوی شاهدی
امتحانی روبروی شاهدی
شاهد عادل که بی تصدیق او
زندگی ما را چو گل را رنگ و بو
در حضورش کس نماند استوار
ور بماند هست او کامل عیار
ذره ای از کف مده تابی که هست
پخته گیر اندر گره تابی که هست

تاب خود را بر فزودن خوشتر است
پیش خورشید آزمودن خوشتر است
پیکر فرسودہ را دیگر تراش
امتحان خویش کن، موجود باش
ایں چنین موجود محمود است و بس
ورنہ نار زندگی دود است و بس

ہمارا ارادہ تھا علامہ اقبال کے حالات اور اُن کے خیالات و اشعار کے بارے میں مختصراً کچھ لکھا جاتے اور اپنے ہم وطنوں سے اُن کا تعارف کرایا جاتے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ جب ایران میں شعر و شاعری زوال و انحطاط کی طرف جا رہی ہے ہمارے ہمسایہ ملک میں ایک عظیم الشان شاعر ہے جس کے افکار بلند ہے اور وہ صاحب ذوق ہونے کے علاوہ غیر معمولی ذہانت اور فطانت کا مالک ہے۔ اسے قدیم و جدید علوم پر دسترس حاصل ہے۔ اس کے فارسی اشعار کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی شہرت یورپ اور امریکہ تک پھیل چکی ہے۔ اور اس نے ادبیات فارسی کے نام کو چمکایا ہے اور ہندوستان میں تحصیل زبان فارسی کے شوق کو از سر نو تازہ کیا ہے۔ لیکن بات کچھ اندازے سے بڑھ گئی اور پھر بھی حق مطلب کے ادا نہ ہونے کا احساس ہے۔ امید ہے کہ میں ایک روز "کلیات" اقبال کی طباعت و اشاعت کر سکوں گا۔ لیکن اگر یہ کام میرے ہاتھوں سے سرانجام نہ پا سکے تو دوسرے لوگ اس کام کو ہاتھ میں لیں گے۔ محمد گلندام کے زمانے سے ایران میں ایک جنون یہ پیدا ہو گیا ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہر شاعر کے کلام کو ترتیب ابجد سے شائع کیا جاتے (یہاں تک کہ مثنوی کے اشعار کو قافیہ ہی کے اعتبار سے چھاپتے ہیں) اس سے بچنا چاہیے۔ علام موصوف کے کلام کو اُسی

طرح طبع کرنے کی ضرورت ہے جس طرح انھوں نے خود شائع کیا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو حواشی انھوں نے اردو میں لکھے ہیں انھیں فارسی میں ترجمہ کر کے شامل کر لیا جائے اور اس پر ایسی توضیحات کا اضافہ کر دیا جائے جو ایرانیوں کے لیے موزوں ہوں۔ اور اگر چاہیں کہ پڑھنے والے شعروں کو آسانی سے سمجھ لیں، تو متعدد فہرستیں جو مضامین اور قوافی وغیرہ پر مشتمل ہوں، تمام تصنیفات کو سامنے رکھ کر ترتیب دی جائیں۔

ہم نژادی، ہم لسانی، دینی اور علمی تعلق، سیاسی اور تجارتی رابطہ جو ہمارے اور پاکستان اور ہندوستان کے درمیان موجود ہے، وہ اس حد تک وسیع ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں اس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ بالخصوص جب کہ کتاب انہی لوگوں میں سے ایک ہستی کے متعلق ہو۔ اگر صرف فارسی زبان ہی کو لیا جائے تو یہ موضوع بھی اس قابل ہے کہ اس پر چند کتابیں لکھی جائیں، جیسا کہ خود اہل ہندوستان نے لکھی ہیں۔ یہاں تک کہ زبان فارسی پر جس کا سلاطین مغول کے دربار میں (امیر تیمور گورگانی کا خاندان) چرچا تھا، متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ اور ادھر یہ حالت ہے کہ اس وسیع سرزمین کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں ایک بھی کتاب ہمارے ملک میں موجود نہیں۔

اب ایشیا کا یہ ملک عظیم، آزاد اور خود مختار ہو چکا ہے۔ (اگرچہ اس کی تقسیم بادام دو مغز کی صورت رکھتی ہے) اب ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں کہ ہم کہیں ہمیں اہل ہند سے رابطہ و اتحاد پیدا کرنے نہیں دیتے۔ ان آخری دو سو سالوں میں فارسی زبان ہندوستان میں محو نہیں ہوئی، اور یہ بات خود ہندوستانیوں کی ہمت کا نتیجہ ہے۔ یہ وسیع سرزمین عنقریب ایشیا کی اہم ترین اور معزز ترین مملکت ہوگی۔ اگر مادی مصلحت اور منفعت کی رو سے بھی دیکھا جائے تو پھر بھی یہ مناسب ہے کہ ہم پاکستان اور

غلط نامہ

(علامہ اقبال از مجتبیٰ مینوی)

نوٹ: پہلا ہندسہ صفحہ، دوسرا سطر کے لیے ہے، خطوط وحدانی کے باہر غلط اور اندر صحیح عبارت درج ہے:

۱۳/۱۳ داعیٔ اسلام (داعی الاسلام) ۱۵/فٹ نوٹ سطر ۲ ہی (بھی) ۲/۱۷ جواہرات (جو اہرات) ۱۸/۱۸ لاز (لاہور) ۲۱/فٹ نوٹ سطر ۲ بڑے (بڑھے) ۱۰/۲۳ شیرین (شیرین تر) ۱۷/۲۷ خنک سار (خنک سار) ۱۳/۲۹ ۱ (اس) ۱/۳۰ دز (ہنوز) ۱۸/۳۰ وسوم (رموز) ۱۹/۳۲ دیدہ ام (دیدہ ام از) ۱۸/۳۷ پک (یک) ۱۵/۳۸ تائب (نائب) ۷/۳۹ نبایان (بیابان) ۱/۴ حاسل (حاصل) ۱۷/۴۰ گردامی (گردابی) ۱۹/۴۰ رفنگان (رفتگان) ۵/۴۱، ۲ بادہ (جادہ) ۸/۴۶ شکاف (شگاف) ۷/۴۹ صبا (صہبا) ۳۵/فٹ نوٹ نمبر ۱ اضافہ ۱۸۴۳ء ۔ ۱۹۱۳ء نیز یہ عبارت اگلے صفحے کے پہلے فٹ نوٹ کا حصہ ہے۔ سطر ۸ سے نشان حاشیہ حذف کر دیں۔ ۲/۵۹ افناد (فتاد) ۱۹/۶۳، رودولبود (بود و نبود) ۲/۶۴ خزدد (خیزد ز) ۱/۷۱ زروتست (زر دشت) ۶/۷۲ شکف (شگاف) ۲/۷۲، ۱۳ قوای (قوائے) ۳/۷۴ باقی (ہم باقی) ۱۶/۷۴ فنای (فنائے) ۲/۷۵ سالی (سالی) ۱۰/۷۵ بایہ (پایہ) ۸۱/فٹ نوٹ سطر ۱ روگرانی (رو گردانی) ۱۸/۸۳، ادب (عرب) ۸/۸۷ سمندر (سمند) ۱۶/۸۸ نبادات (نباتات) ۳/۹۲ آوارہ (آوازہ) ۶/۹۲ دسازد (نسازد) ۳/۹۸ سلسہ (سلست) ۱۹/۸۹ سلیقہ (سابقہ) ۱۳/۱۰۰، نبات (ثبات) ۹/۱۰۰، زبان (زمان) ۱۲/۱۰۲ دتا (دیتا) ۲/۱۰۲ ول ندر نباد و خم (ولی ندر نہاد و جم) ۱۱/۱۰۳، ۱۲، ۱۳ بودہ (بود) ۱۳/۱۰۳، است (ماست) ۲/۱۱۰ زمان (زمین) ۲۲/۱۱۱ گرمی (از گرمی) ۱۷/۱۱۳ شیشہ و ماہ (شیشۂ ماہ) ۸/۱۲۱ منس (مس) ۳/۱۲۱ گذری (گدازی) ۵/۱۲۲ ... (روزن) ۱۰/۱۲۶ بلند ہے (بلند ہیں) ۲۱/۱۲۶ علام (علامہ)۔